رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۴۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۷	محرم سنہ ۱۳۷۱ھ — مطابق — اکتوبر سنہ ۱۹۵۱ء —	عدد ۱

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن - اچھرہ، لاہور
سے شائع کیا

اِشارات

شیطان کی بڑی کامیابی یہ نہیں ہوتی کہ دو چار افراد کے افکار و اعمال میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ اس کی بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ کسی معاشرہ کے اجتماعی ماحول کو فاسد بنا دے۔ اس کام پر شیاطین کو بڑی لمبی اور صبر آزما محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن جب یہ کام ہو جاتا ہے تو پھر ابلیس کے سپاہی چین سے بیٹھ کر اپنے کارناموں کو برگ و بار لاتے دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کسی ریاست اور قوم میں جب ایک مرتبہ معصیت کی نخل بندی اچھی طرح ہو جاتی ہے تو پھر پودے خود ہی بیج بکھیرتے رہتے ہیں، بیج خود ہی زمین میں جگہ پکڑتے ہیں، بیجوں سے خود ہی نئے پودے پھوٹتے ہیں اور نئے پودے پھر خود ہی گل کھلاتے رہتے ہیں۔ یہ کھیتی جب اس طرح سدا بہار ہو جاتی ہے تو اسے کسی مالی کی ضرورت نہیں رہتی۔

پھر اگر اس طرح کا فاسد ماحول قوم گیر اور ملک گیر ہونے سے بھی آگے بڑھ کر عالمگیر بن جائے اور ایک دورِ تہذیب کی وسعت اپنے اندر پیدا کر لے تو اس کے بعد تو قرنوں تک کے لیے شیاطین کو چھٹی مل جاتی ہے کہ وہ پاؤں پھیلا کر سوئیں۔ آج ہمیں بھی بالکل اسی درجہ کے فاسد ماحول سے سابقہ درپیش ہے۔

اس ماحول میں رہتے ہوئے آپ رزقِ حرام سے کتنی ہی گہری نفرت رکھتے ہوں لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ معیشت کی رگ رگ میں "سود" کی لعنت، رشوت کی پیپ اور خیانت آمیز نفع اندوزیوں کا زہر خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ ہر وہ سکہ جو یہاں دست گرداں ہے معاشی ظالم کی بھٹیوں میں کتنی ہی بار تپ کر اور گندے اخلاق میں کتنے بھاؤ کھا کر آپ تک پہنچتا ہے۔ یہاں بازار میں جا کر آپ اگر ایک پنسل بھی خریدتے ہیں تو اس مظلوم کی قیمت پر نجانے اخلاقی مفاسد کے کتنے غیر محسوس بوجھ لدے

ہوتے ہیں۔ اس ماحول میں جو لوگ فی الواقع "حلالِ طیب" کی جستجو کرتے ہیں ان کو فاقہ کے سوا کچھ نہیں ملتا لیکن جو لوگ اپنے معدے کے دروازے "ھٰذا من فضلِ ربی" کہہ کر حرام کے لیے کھول دیں اُن پر رزق کی وہ بارش ہوتی ہے کہ وہ جی کھول کر اسراف کر سکیں۔

آپ اپنا جائز سے جائز حق حاصل کرنے کے لیے کسی طرف رُخ کریں تو یہ ماحول آپ سے ہر قدم پر اپنی روحِ فسق کے لیے نذرانہ طلب کریگا۔ آپ کسی ضرورت کو پورا کرنا چاہیں تو اس تک پہنچنے کے لیے آپ کو عین ان طاقتوں کا دامن تھامنا پڑے گا کہ جن پر اپنے وعظوں اور اپنے فتووں میں نہ جانے کن کن سخت الفاظ سے آپ اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ آپ کتنے ہی پاکیزہ مقصد کے لیے گھر سے نکلیں لیکن یہ ماحول اس تک پہنچنے کے لیے آپ کو ایسے ایسے "کوچہ ہائے زنبیاں" سے سر کے بل گذرنے پر مجبور کریگا کہ آپ اپنی بے بسی کا ماتم کرتے رہ جائیں۔

فاسد ماحول میں کسی مرد کی حیاداری اور کسی خاتون کی عصمت پسندی کو ساری عمر چومکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ بے حیائی ہر سمت سے نئے نئے اسلحہ کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے اور بار بار حملہ آور ہوتی ہے۔ وہ بناؤ سنگار کر کے نکلتی ہے، وہ نمائش اور مظاہرے کی اسپرٹ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، وہ شعر کا لباس پہنتی ہے، وہ افسانے کا بہروپ بھرتی ہے، وہ صحافت اور ادب کے ایوان میں مسند آرا ہوتی ہے، وہ اشتہاروں میں نمایاں ہوتی ہے، وہ تصویر کا کاغذی پیرہن زیبِ بدن کرتی ہے، وہ رقص گاہوں میں ناچتی ہے، وہ مینا بازار لگاتی ہے، وہ کیمروں کے سامنے پریڈیں کرتی ہے، وہ ضیافتوں اور دعوتوں اور تقریبوں میں پیش پیش رہتی ہے، وہ سنیماؤں میں ہنگامے مچاتی ہے اور وہ ریڈیو سے طوفانِ صوت بن کر بہتی ہے۔

اس کے مقابلے میں آپ اپنی فطرت کی پاکیزگی کے زور پر "غضِ بصر" کرتے ہیں لیکن بے حیائی خود آگے بڑھ کر آپ کی آنکھوں میں گھستی ہے، آپ اس کے لیے گوش بر آواز نہیں ہوتے لیکن وہ خود اپنا پیغام آپ کے کانوں میں ڈالتی ہے، آپ کو اس کی بُو سے نفرت ہے لیکن وہ عطر کی لپٹوں میں

تحلیل ہو کر آپ کے مشام پر حملہ کرتی ہے۔

یہ فاسد ماحول کا جادو ہے کہ حیاداروں اور عصمت پسندوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ان کو کورذوق شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن بے حیائی اور بے عصمتی ترقی پسندی اور تہذیب اور کلچر کی علامت قرار دی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ماحول عصمت و حیا کو پیچھے دھکیلتا ہے اور بے عصمتی و بے حیائی کو اگلی صفوں میں جگہ دیتا ہے۔ ایسے حالات میں کون حساب لگا سکتا ہے کہ کتنی ہی سعید روحیں ہیں کہ جو بے حیائی کے اس طوفان کے ریلوں سے لڑتے لڑتے آخر کار دم توڑ دیتی ہیں۔ اور کون اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے افراد کی عصمت پسندی کے مظاہرے کے پس پردہ ان کے تحت الشعور میں ماحول کے فاسد اثرات گھس کر ڈیرے ڈال چکے ہیں اور وہ برابر ان کی سیرتوں کو دیمک بن کر چاٹ رہے ہیں۔

پھر آپ کچھ اور پہلوؤں سے ماحول کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ یہاں ایمانوں، ضمیروں، سیرتوں اور اصولوں کی ایک منڈی لگی ہوئی ہے اور دنیا و دین کی ہر متاعِ عزیز نیلام کا مال بنی اس میں دھری ہے۔ اس منڈی میں گھوم کر چاہے آپ سیاست کے بازار کو دیکھیں، چاہے ادب و صحافت کے بازار کو اور چاہے مذہب و تصوف کے بازار کو، ہر جگہ ایک ہی سماں ہے۔ انسانیت کے پاس جو کچھ ہے وہ بکاؤ مال بن چکا ہے۔ بکنے کو سب کچھ بک رہا ہے، لیکن چھوٹے ظرف کے تاجر ارزاں فروش ہیں اور بڑے سرمائے کے تاجر بھاری قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ انسانیت کے اچھے سے اچھے پیکروں کا آپ سودا چکتا دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی چند سکوں میں، کوئی ایک تنخواہ کے عوض، کوئی کسی عہدہ و منصب کے بدلے میں، کوئی یورپ کی سیاحت کی قیمت پر، کوئی لیڈری کے مول، کوئی کسی انجمن کی صدارت پر اور کوئی محض زندہ باد کے نعروں کے داموں اٹھ رہا ہے۔ آپ اگر صاحب احساس ہوں تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے چاروں طرف سے آپ کو سکے ٹھنکھناتے ہوئے کچھ تاجر گھیرے ہوئے ہیں اور وہ برابر اس کوشش میں ہیں کہ کب آپ مالِ تجارت بننے پر راضی ہوں

اور کب وہ اس سودے سے نفع کمانے کے قابل ہوں۔ انسانیت کے اس زوال کی فضا میں باصول مسلمان بن کر زندگی گذارنا کھیل نہیں ہے۔ یہاں ایک صاحب ایمان ہمہ وقت جیب کتروں کے درمیان گھرا ہوا ہے، ذرا غفلت ہوئی نہیں کہ جیب کٹی نہیں!

فاسد ماحول کا ایک لازمہ یہ ہے کہ اس میں نظام حیات کی باگ ڈور فسق کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ سوسائٹی اپنے اندر سے انتہائی پست کردار اور اخلاق باختہ مگر ذہین اور عیار لوگوں کو ابھار کے اوپر لاتی ہے اور اپنے اندر کے شرفا کو زیادہ سے زیادہ پست اور بے بس کر کے رکھتی ہے۔ اس صورت حالات کو نبی صلعم نے اپنے بعض ارشادات مطہرہ میں پوری طرح واضح فرما دیا ہے۔

یہ لوگ فاسد ماحول کے بہترین نگہبان اور اسے ہر خطرے سے بچانے کے لیے بہترین محافظ ہوتے ہیں۔ یہ اوپر بیٹھ کر ملک کی معاشی پالیسی بناتے ہیں، یہ عوام کی ذہنیت کو ایک خاص تشکل دینے کے لیے تربیت کے مختلف وسائل اختیار کرتے ہیں، یہ نئی نسل کو ایک خاص نقشے پر ڈھالنے کے لیے نظام تعلیم بناتے ہیں، یہاں تک کہ فاسد ماحول کے بنیادی اصول و نظریات کا ایک قفس قوم کی قوم کے گرد تیار ہو جاتا ہے جس پر قانون کے کڑے پہرے قائم ہوتے ہیں اور اس کی حدود سے نہ کوئی مسجد باہر رہ جاتی ہے، نہ مدرسہ و خانقاہ!

ایسی حالت میں ایک صحت مند معاشرے کے بالکل برعکس "معروف" سے روکنے اور "منکر" کو فروغ دینے کا پورا پورا اہتمام ہوتا ہے۔ قوم کا روپیہ، اس کے وسائل، اس کے دماغ اور اس کی صلاحیتیں بہت بڑے پیمانے پر اس مہم میں لگ جاتی ہیں۔ اس طرح جب ایک ہمہ گیر فساد کام کر رہا ہو تو اس میں اچھے اچھے صالحین کا ذوق اصلاح پسندی بے بس ہو کے رہ جاتا ہے "منکر" کے ایک ہنگامہ خیز نقار خانے میں "معروف" بچارا طوطی بن کر چہچہاتا ہے لیکن اس کی آواز منکر کے شور و شر میں ڈوب کر رہ جاتی ہے

فاسد ماحول میں ظلم، خیانت، بداخلاقی، بے شرمی، بے اصولی، نفع پرستی، بندگیٔ اغراض، کمزور آزاری، لوٹ مار اور دوسری بداخلاقیوں سے دن رات لوگ زخم کھاتے ہیں اور کراہتے ہیں، لیکن مظلومی کے نت نئے نمونوں کو کثرت سے دیکھتے دیکھتے اچھی فطرت کے لوگوں میں بھی ہمدردی کی حس سُن ہونے لگتی ہے۔ یہ چیزیں معمولات بن جانے کی وجہ سے اپنی اپیل کی طاقت کھو بیٹھتی ہیں۔

پھر مشکل یہ کہ ظلم ہوتا ہے لیکن ظلم کرنے والا ہاتھ نظر نہیں آتا، جیبیں کاٹی جاتی ہیں مگر جیب کترے مشخص نہیں ہوتے، چوری عام ہوتی ہے لیکن چور کا کوئی سراغ نہیں ملتا، خون چوسا جاتا ہے مگر جونکیں ہاتھ نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ سارا کھیل کسی ایک یا چند افراد کا کھیل نہیں ہوتا، یہ اجتماعی نظام کی ساخت ہوتی ہے جس میں خطائیں ہوتی ہیں لیکن "خطاوار" کا پتہ نہیں چلتا!

ایسا ماحول ہمہ وقت کی ایک آزمائش ہوتا ہے اور ایسی آزمائش ہوتا ہے کہ جس میں کوئی ایک قدم چل کر اور کوئی چار قدم چل کر ہمت ہار دیتا ہے، شاذ ہی کوئی سعید روح ساری عمر اس کٹھالی میں رہ کر صحیح سلامت نکلتی ہے۔ یہ ذہنیت اور یہ تہذیب ایک ایسا آہنی سانچہ بن کر افراد کو گھیر لیتا ہے کہ جو اس کی شکل اختیار نہ کرے اس کو چاروں طرف سے چوٹیں کھانی پڑتی ہیں۔

فاسد ماحول کے ہوتے ہوئے تقدس و تقویٰ کے کمال کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فرد انسانی نظامِ تمدن میں رہتے ہوئے اتنی وابستگیاں رکھتا ہے کہ اجتماعی نظام کی تطہیر کے بغیر اور فاسد ماحول کو توڑے بغیر اس کے تزکیہ کی تکمیل محال ہے۔ ایک آدمی چاہے یا نہ چاہے، وہ بہر حال کسی خاندان کا رکن، کسی منڈی کا تاجر، کسی کارخانے کا مزدور، کسی ادارے کا ملازم، کسی بستی کا باشندہ، کسی مذہب و ملت کا پیرو، کسی انجمن یا جماعت کا ممبر، کسی حکومت کی رعایا اور کسی ریاست کا شہری ہوتا ہے۔ یہ مختلف تنظیمیں اور ادارے جس نظامِ اجتماعی کے تابع ہوتے ہیں اگر وہ اپنی فطرت میں ناپاک ہو تو یہ بات ناقابلِ تصور ہے کہ پاکبازی کی ہزار مساعی کے باوجود ایک فرد اپنے آپ کو پوری طرح تو کیا، بڑی حد تک بھی پاک رکھ سکے۔ رات دن ان مختلف روابط کے ذریعے ناپاکی کے ریلے آ آ کر اس سے

ٹکراتے ہیں، وہ جدھر جاتا ہے منکرات کی کیچڑ سے لت پت ہوتا ہے، وہ جس فضا میں سانس لیتا ہے گندی ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے، وہ جس سے ملتا ہے اُس سے کسی نہ کسی طرح کی اخلاقی چھوت لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اپنے گھر کی پناہ گاہ میں اس کی اپنی بیوی اور اس کے اپنے بچے اور اس کے اپنے باپ اور بھائی کہاں کہاں سے کن کن مفاسد کے جراثیم ساتھ لے آتے ہیں۔

جہاں چاروں طرف کوڑے اور گوبر اور لید کے ڈھیر پھیلے ہوئے ہوں، جہاں ہر طرف لاشے سڑ رہے ہوں، جہاں گلیاں بیت الخلا بنی ہوئی ہوں، جہاں سڑکوں پر راکھ پھیلی ہوئی ہو، جہاں گڑھوں میں پانی جمع ہو ہو کر سڑتا رہے اور جہاں راج پاٹ سارا غلاظت پسندوں کے ہاتھ میں ہو وہاں ایک نفاست پسند آدمی صابن مل مل کر نہائے، دن میں دس مرتبہ مسواک اور کلیاں کرے، روزانہ ناخن ترشوائے، صبح شام بال آراستہ کرے اور اپنے کپڑے ہر دوسرے روز بدلتا رہے تو بھی غلاظت کے ماحول میں رہ کر کبھی بھی اپنے پاکیزہ ذوق کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ وہ جو آٹا اور سبزی خرید کر لاتا ہے۔ اس میں گندگی مل کر آتی ہے، وہ جس کنوئیں سے پانی بھرتا ہے اس میں گندگی شامل ہے، وہ جن سڑکوں پر پیدا ہے وہ اس پر کیچڑ اچھالا کرتی ہیں، وہ جس فضا میں ہوا خوری کرتا ہے اُس سے بھی اسے گرد اور بدبو کے سوا کچھ نہیں ملتا، وہ جس قہوہ خانے میں بیٹھ کر چائے پیتا ہے وہاں بھی ناپاکی سے اس کی تواضع کی جاتی ہے اور وہ جس کسی سے مصافحہ کرتا ہے اس کے ہاتھ بھی اپنے میل میں سے اسے حصہ دیتے ہیں!

یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ قطعی طور پر ایک حالتِ اضطرار ہے۔ اور ایک فردِ مومن اس طرح کے فاسد ماحول میں اللہ کے نزدیک اپنی استطاعت کی حد تک ذمہ دار ہے۔ اس نے اگر اپنی بساط بھر پاکیزگیٔ اخلاق پیدا کرنے کی سعی کر لی تو وہ اللہ کے سامنے ایک متقی ہی کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ لیکن یہ چیز قابلِ غور ہے کہ اس کی استطاعت کے مطابق فی الواقع خدا کے دین کا مطالبہ اس سے کیا ہے؟

ایسے فاسد ماحول میں گھرے ہوئے مومن سے اس کا ایمان دو مطالبے کرتا ہے:۔

ایک یہ کہ وہ ماحول کے اثرات اور گندگیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پاکیزگیٔ اخلاق اور طہارتِ نفس پیدا کرنے کے لیے عملاً جو کچھ کر سکتا ہے اس کو آخری حد تک کرے۔

دوسرے یہ کہ فاسد ماحول کا تسلط ختم کرنے اور اس کی جگہ ایک صالح ماحول کو برپا کرنے کے لیے جدوجہد اور سرگرمی کا جو حصہ وہ ادا کر سکتا ہو اسے پوری عزیمت سے ادا کرے۔

خوب سمجھ لیجیے کہ کسی فاسد ماحول میں ایمان، تقویٰ اور احسان کی راہ صرف یہی ہے۔

انبیاء علیہم السلام نے سارا کام انہی دو خطوط پر کیا ہے۔ خود نبی صلعم کی آخری روشن مثال کو اگر سامنے رکھیے تو حقیقت کو سمجھنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ آنحضورؐ اگر انفرادی تزکیہ کا کوئی پروگرام لے کے آئے ہوتے تو قریش سے خواہ مخواہ کی ٹکر لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی جس طرح آج بے شمار مصلحین اور دیندار اور معلمینِ اخلاق ایسے موجود ہیں کہ چپکے سے کنارے بیٹھ کر اپنا کام کر رہے ہیں اسی طرح آنحضورؐ بھی تعلیم و اصلاح کا ٹھنڈا ٹھنڈا کام کر سکتے تھے۔ کوئی ان سے الجھتا بھی تو اس سے بہ حکمت اپنا دامن بچا لیتے۔ لیکن فی الواقع وہاں پروگرام کی یہ نوعیت تھی ہی نہیں۔ وہاں تو اسلامی تقویٰ کے اصولوں پر ایک سوسائٹی، ایک ریاست اور ایک ماحول بنا کر وہ سانچہ فراہم کیا گیا کہ جو اپنے مزاج کے مطابق تقویٰ کے نمونے تیار کرے اور ان سے کام لے۔ نبی صلعم کا اسوۂ حسنہ ایک فرد تک محدود رہنے والا نہیں تھا، بلکہ اس اسوۂ حسنہ نے ایک نظامِ جماعت کی صورت اختیار کی اور پھر وہ فاسد ماحول سے کشمکش کر کے ایک صالح ماحول کی ہمہ گیر وسعتوں کے ساتھ سارے عرب پر چھا گیا جب کہیں جا کر یہ اعلان ہوا کہ "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ"!

مسلمانوں میں طہارت و تقویٰ اور تزکیہ کے لیے جو ادارہ کئی صدیوں سے پیش پیش ہے وہ تصوف

کا ادارہ ہے۔ اس کا ایک مستقل علم کلام ہے اور فن تزکیہ کی ایک مستقل ٹیکنیک ہے۔ اس کی مختلف شاخیں ہر ملک میں پھیلی ہوتی ہیں اور اس کا اپنا لٹریچر بھی بہت وسیع ہے۔ اس ادارے نے اپنے طرز پر افراد سازی کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن افسوس کہ تصوف کا بھی ادارہ ایسے ہاتھوں سے تاسیس پذیر ہوا ہے جو فاسد ماحول کے سامنے ہتھیار ڈال کے ایک مرتبہ پسپا ہوئے تھے اور پھر وہ جہاد بالنفس میں ایسے محو ہوئے کہ انہیں اجتماعی فساد کے خلاف معرکہ آرائی کی ذمہ داریاں بھولے سے بھی کبھی یاد نہ آئیں۔

اس تصوف کے تیار کردہ بہترین افراد کو اگر آپ قریب سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ انفرادی تزکیہ کے آگے کی کوئی منزل سرے سے سامنے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے روبرو اجتماعی مفاسد کے نت نئے طوفان اُبلتے رہتے ہیں لیکن ان کے خلاف ان میں کوئی سرگرمی پیدا نہیں ہوتی۔ سرگرمی کیسے پیدا ہو جب کہ یہ تصور ہی گم ہو چکا ہے کہ اجتماعی مفاسد سے ٹکرانے کی ذمہ داری بھی کوئی دینی تقاضا ہے اور اسی پر افراد کے تزکیہ کا دارومدار ہے۔

ہماری خانقاہیں اور ہمارے تزکیے کے ادارے ایک سال میں جتنے افراد کو تیار کرتے ہیں اگر وہ فاسد ماحول سے کشمکش کرنے کے فرض کا احساس رکھنے والے ہوتے اور منظم جدوجہد کرنے کے اسلامی اصول ان کے پیش نظر ہوتے تو ان کے ذریعے ایک قیامت مچ گئی ہوتی مگر صحیح طرز فکر کے گم ہو جانے کی وجہ سے ہمارے اچھے اچھے متقی اُٹھتے ہیں اور بڑے بھولے پن کے ساتھ اپنے فاسد ماحول کی بیش بہا خدمات انجام دے جاتے ہیں۔ فاسد ماحول تصوف کے ادارے سے اچھے سے اچھے اور سستے سے سستے کارکن حاصل کرتا ہے اور اس کی مشین میں جتنا اچھا کام شریف اور ایماندار پرزے کر جاتے ہیں اتنا معمولی قسم کے پرزے نہیں کر سکتے۔

سالہا سال سے تقویٰ اور تزکیہ کا انفرادی تصور لے کر کام کرتے کرتے اور فاسد ماحول سے مصالحانہ رویہ رکھتے رکھتے ان اداروں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ فاسد ماحول کو صالح ماحول سے بدلنے کی سعی ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سعی کو انہی کے ہاں سے سب سے

کم سپاہی ملتے ہیں۔

اب اگر اکابرینِ تصوف اپنے فلسفہ کو خالص اسلامی ثابت کرنے بیٹھیں، وہ "تصورِ شیخ" کی بہتر سے بہتر تعبیر پیش کریں، وہ "مراقبہ و مکاشفہ" کا مفہوم پورے اطمینان بخش انداز میں بیان کریں، وہ "ہمہ اوست" اور "فنا فی الذات" کے اسرار کو زیادہ سے زیادہ عقلی رنگ دیں، وہ "فیضِ نظر" اور "توجہ" اور "ہمت" کی معقولیت پر کتنا ہی اچھا استدلال کریں، آخر اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے یہ چیزیں بے کار ہیں جو اجتماعی فساد کے خلاف جدوجہد ترک کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے۔ تصوف نے اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے انفرادی تزکیہ میں مسنون حد سے آگے بڑھ بڑھ کر مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن افسوس کہ یہ مبالغہ اس خلاء کو کبھی پُر نہیں کر سکتا۔

تصوف کے کارنامے کو جب بھی کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھا جائیگا تو سب سے اہم سوال یہی پیدا ہوگا کہ اس ادارے کے سند یافتہ متقی حضرات نے اجتماعی فساد کے مقابلے میں اب سے پہلے کیا کچھ کیا ہے اور اب وہ کیا کر رہے ہیں؟ اس کا اگر کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دیا جا سکے تو پھر یہ مسئلہ بڑا توجہ طلب ہے کہ تصوف کے بنیادی نظریے، اس کی فکر، اس کے علمِ کلام، اس کی ٹکنیک اور اس کے مزاج میں کہیں نہ کہیں کوئی بڑی بھاری غلطی موجود ہے۔ اس غلطی کی تلاش اور اس کا تعین کرنا ایک بڑی قابلِ قدر خدمت ہوگی۔

بخلاف اس کے اصلاح و تزکیہ کی سیدھی سادی راہ یہ ہے کہ ایک مومن و مسلم اگر فاسد ماحول میں گھرا ہوا ہو تو وہ ایک طرف امکانی حد تک اپنی ذات کو آلائشوں سے پاک کرے، فرائض و واجبات اور مستحبات کو اختیار کرے اور حرام اور مکروہ امور سے بچے، لیکن اپنی اسی کوشش کی عملی تکمیل کے لیے دوسری طرف فاسد ماحول کے خلاف اپنے جان و مال اور اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں سمیت اسلام کے سکھائے ہوئے اصولوں پر کشمکش کرے۔

یہ کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہمارا قومی و ملکی ماحول بدل جائے، بلکہ ملکی و قومی ماحول کو آلودگیوں سے پاک رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے دورِ تہذیب اور اپنے بین الاقوامی ماحول کو بدلنے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر جدوجہد کی جائے۔

کمالِ تقویٰ و تزکیہ تک پہنچنے کی واحد راہ یہی ہے!

اجتماعِ عام جماعتِ اسلامی پاکستان

بمقام کراچی بتاریخ ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے اجلاس منعقدہ یکم تا چار ستمبر ۱۹۵۱ء میں فیصلہ کیا ہے کہ جماعت کا آئندہ اجتماع عام کراچی میں ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء مطابق ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ صفر ۱۳۷۱ھ بروز ہفتہ، اتوار، پیر، منگل منعقد کیا جائے ـــــ اس اجتماع میں تمام ارکانِ جماعت کی شرکت لازم ہوگی۔ الا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ مشرقی پاکستان کے ارکان اور خواتین کے لیے شرکت لازم نہیں ہوگی لیکن اگر وہ شریک ہونا چاہیں تو اپنے اس ارادے کی اطلاع ناظم اجتماع کو بھیج دیں۔ ان کے لیے انتظام کیا جائیگا۔ متفقین اور جماعت سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے حضرات کے لیے ہماری طرف سے دعوتِ عام ہے کہ وہ حتی الامکان ضرور تشریف لائیں اور جماعت کو، اس کے اب تک کے کام کو اور آئندہ پروگرام کو بلاواسطہ سمجھنے کی کوشش کریں۔

کراچی باہر سے تشریف لانیوالے تمام شرکاء اجتماع کیلیے قیام و طعام کا انتظام جماعت کی طرف سے کیا جائیگا۔ اور مصارف طعام کیلیے پانچ روپے فی کس وصول کیے جائینگے۔ الا یہ کہ کوئی شخص اپنے کھانے کا انتظام خود کرنا چاہے۔ ارکان جماعت کیلیے اجتماع کے چار دن جماعت کی قیامگاہ میں رہنا بہرحال لازم ہوگا۔ وہ تمام حضرات جو اس اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہوں اپنے اس ارادے سے قیم جماعت اسلامی حلقہ سندھ و کراچی چودھری غلام محمد صاحب ع۹ نیا بلڈنگ آرام باغ روڈ، کراچی کو مطلع کر دیں اور اس میں اس امر کی واضح طور پر صراحت کر دیں کہ وہ جماعت کے قیام و طعام کے انتظام میں شریک ہونگے یا اپنا انتظام کرینگے اس اطلاع کی ایک نقل انہیں اپنے ضلع کے امیر کو بھی بھیجنی چاہیے۔ مناسب یہ ہوگا کہ ایک مقام سے شریک ہونے والے تمام حضرات یہ اطلاع حتی الامکان یکجا روانہ کریں۔

خاکسار طفیل محمد قیم جماعت اسلامی پاکستان۔ اچھرہ۔ لاہور

دعوتِ اقامتِ دین کے وسیع تقاضے

مراحلِ کار اور لائحۂ عمل

(از جناب حکیم حبیب الزمان صاحب صدیقی)

دعوتِ اقامتِ دین کی انقلابی مہم اور اس کے تدریجی مراحل کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کارِ نبوت سے متعلق ایک جامع تصور پہلے سے ذہن میں موجود ہو۔ اور پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی مہم کا نقطۂ آغاز کیا تھا، کام کی نوعیت کیا تھی اور کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا پڑا؟ ان باتوں کا سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے لوگ ان اہم اور بنیادی مسائل کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دینی انقلاب کے وسعت گیر تقاضوں کو محدود کر دیتے ہیں۔ اور اس غلط اعتقادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعمیر و انقلاب کی جدوجہد حیاتِ انسانی کے گوناگوں مسائل سے ہٹ کر کسی ایک ہی گوشۂ زندگی میں سمٹ جاتی ہے ظاہر ہے کہ محدود اور یک جہتی کوشش خواہ کتنی ہی ہنگامہ خیز اور بظاہر جاذبِ نظر کیوں نہ ہو لیکن نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ ہم اگر ملتِ اسلامیہ کے ماضی اور حال کی علمی مساعی اور تعمیر و اصلاح کی جدوجہد کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا چاہیں تو بڑی مشکل سے چند ایسی مثالیں دستیاب ہونگی جن میں فی الواقع کارِ نبوت کی ہمہ گیرانہ حیثیت اور دینی دعوت کے تدریجی مراحل کو ملحوظ رکھا گیا۔ کچھ لوگوں کی جدوجہد صرف مسائل بعد الموت کو حل کرنے کے لیے وقف ہو گی۔ چند اعتقادی مسائل ہی ان کے فکر و نظر، مناظرانہ موشگافیوں اور باہمی جنگ و جدل کا موضوع بن گئے۔ کچھ دوسروں کو آخرت کے تصور نے جو درحقیقت اِس کارگہِ حیات میں موثرترین محرکِ عمل ہے، نے زندگی کے عملی اور ٹھوس حقائق سے بالکل بیگانہ کر دیا، اور ایک گروہ نے کارِ نبوت کو محض مادی قوت و اقتدار اور حکومت و سیاست سے مخصوص کر دیا۔ یہ سب کچھ دعوتِ نبوی کے منشا و مقصود کو نہ سمجھنے یا مفاد پرستی

کے مہلک اجتماعی مرض کا نتیجہ ہے۔

فطرتِ انسانی کے مطالبے | کا دین نبوت کی واضح اور جامع تعبیر انسانی فطرت کے حقیقی اور مستقل مطالبات کی تکمیل ہے لیکن یہ حقیقی اور مستقل مطالبات کیا ہیں؟ درحقیقت ان مطالبات کو سمجھے بغیر کارِ نبوت کی نوعیت کا تعین کسی صورت ممکن نہیں ہے اور ان مطالبات کو سمجھنے کے لیے چند امور کو پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ ایک یہ کہ انسان اپنی طبیعت اور فطرت سے ایک ایسی زندگی کا خواہش مند ہے جس کا حال اور مستقبل پُرامن، خوشحال اور مسرت بداماں ہو لیکن عقل و وجدان اور حقائق و تجربات کی روشنی میں یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ پُرامن زندگی اور بے چین زندگی کا تعلق براہِ راست خود انسانی اعمال سے ہے۔ یہ انسان کا کام ہے کہ وہ جس زمین میں رہتا ہے اس کو بدامنی و بے چینی کا جہنم یا امن و خوشحالی کی جنت بنائے۔

دوسرے یہ کہ انسانی اعمال کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا ایک حصہ اس زندگی کے لیے مخصوص ہو اور دوسرا بعد الموت کے لیے! بلکہ اعمال جیسے بھی ہوں وہ دنیا اور آخرت میں جزا و سزا کے اعتبار سے ایک ہی قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ جن اعمال کو قرآن حکیم نے اعمال صالحہ کہا ہے وہ درحقیقت قوانینِ فطرت سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور ان کے نتائج اسی زندگی سے شروع ہو جاتے ہیں، اور جن اعمال کو اعمالِ سیئہ کہا گیا ہے وہ فطرت کے نقیض ہیں اور ان کے نتائج بھی ہماری اسی زندگی سے ابتدا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا ہر عمل ایک دائمی اور مستقل اثر رکھتا ہے جو موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی کو یکساں متاثر کرتا ہے، گویا ہماری موجودہ زندگی اور آنے والی زندگی میں گہرا تعلق ہے اور ان دونوں کے ربط و تسلسل کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ جنت یا رضاء الٰہی کے لیے محنت و ریاضت کرتے ہیں اگر ان کے اعمال فی الواقع ویسے ہیں جو قرآنی مفہوم کے مطابق عمل صالح کے تحت آسکتے ہیں تو ان کا طبعی اور ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی جنت سے پہلے دنیا میں بھی آزاد، پُرامن اور خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (آیہ)

جو نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں اس کو اس کے اعمال کی نسبت سے زیادہ اجر دیں گے۔

اور اگر ان کے اعمال اس زندگی میں کوئی بہتر اور خوشگوار نتیجہ نہیں پیدا کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال اس روح سے بالکل خالی ہیں جو ان کی ذات، ماحول اور حیات بعد الموت پر اثر انداز ہونے والی ہوتی ہے۔

قرآن حکیم بار بار اقوام ماضیہ کے حالات میں مکافات عمل کے اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ ہر شخص یہ سمجھ لے کہ اعمال بد کے نتائج کے لیے صرف آئندہ زندگی ہی کا انتظار ضروری نہیں بلکہ اس زندگی میں بھی ان اعمال کی سزا ملتی ہے، یہ اس لیے کہ ان اعمال کی طبیعت اور فطرت ہی ایسی ہے کہ اسی زندگی سے ان کے نتائج شروع ہو جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ قرآن حکیم کے لفظ "الآخرۃ" سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اس زندگی کے اعمال کے نتائج صرف قیامت ہی کو ظاہر ہوں گے۔ حالانکہ الآخرہ کا لفظ قرآن حکیم میں نتائج اعمال یا مکافات عمل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جو اس زندگی کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ مفسرین نے بھی اسی خیال کو ترجیح دی ہے۔

وحمل الآخرة على ظاهرها من خيري الدنيا والآخرة اولى

الآخرہ کو اس کے ظاہری مفہوم یعنی دنیا و آخرت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ (تفسیر خازن)

رہی یہ بات کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ اعمال اچھے ہیں اور یہ بُرے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لیے صرف حضرات انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے دین فطرت ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ صرف دین قیم ہی کا کام ہے کہ وہ انسان کو خیر و شر کی قدروں سے متعارف کرتا اور اس کو نیک و بد کی تمیز کا ملکہ عطا کرتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جس طرح موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی میں باہم ربط و تعلق ہے اسی طرح انسان

کے جسم و روح میں بھی گہرا رشتہ ہے اور ان دونوں کا باہم تعاون زندگی کو صحیح راہ پر چلا سکتا ہے۔ جو چیزیں جسم کو درکار ہیں وہ اس کے لیے مہیا ہوں اور جو روح کے لیے ضروری ہیں وہ اس کے لیے موجود ہوں۔ اگر ایک کے لیے سب کچھ ہو اور دوسرے کو بالکل محروم چھوڑ دیا جائے تو اس سے نہ صرف افراد و اشخاص پر بلکہ جماعات اور اس سے بھی بڑھکر نظامِ کائنات پر تباہ کن اثر پڑتا ہے۔

ان تصریحات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسانی فطرت پوری زندگی میں اعتدال و توازن چاہتی ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر مستقل اور جاودانی مسرت و خوشحالی کی خواہشمند ہے یعنی صرف موجودہ زندگی کی مسرت ہی نہیں بلکہ حیات بعد الموت کی مسرت بھی چاہتی ہے اور اس مقصد کے لیے فطرت کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ انسان کے تمام اعمال متوازن ہوں۔ گویا فطرت زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ فکر و ذہن سے متعلق ہو یا عمل و کردار سے، کجی، ناہمواری اور بے اعتدالی کو ہرگز برداشت نہیں کرتی بلکہ وہ سراسر اعتدال اور مکمل توازن کی متقاضی ہے اور فطرت کا ہمہ گیر قانون یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام شعبوں، تہذیب و ثقافت، اخلاق و معاشرت، سیاست و معیشت، بین الملی تعلقات اور تمام شخصی و اجتماعی اعمال میں اعتدال و توازن قائم کرنے سے ہی اس زندگی اور آنے والی زندگی کو آلام و مصائب اور بدامنی و بے چینی سے بچا سکتا ہے۔

کائنات کا جامع اور ہمہ جہتی تصور: کائنات عالم انقلاب و تغیر کی آماجگاہ ہے۔ انسانی جماعتوں کا بننا اور بگڑنا ایک محسوس اور مشہود حقیقت ہے اور انسانی تاریخ کا کوئی دور اس کی نمود سے خالی نہیں رہا۔ آج جو قوم بن رہی ہے کل تک اس کو بہرحال بگڑنا ہے لیکن اس کا بگاڑ بھی کسی نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ فطرت ہر لمحہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہتی ہے لیکن یہ محض مشقِ ستم کے طور پر نہیں بلکہ ایک بلند تر مقصد کے لیے ہے۔ فطرت اگر کسی چیز کی تخریب چاہتی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ بگاڑ کو پسند کرتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ کائنات کو بنانا اور سنوارنا چاہتی ہے اور اس تعمیری مقصد کی خاطر وہ ہر قسم کی تخریب کے لیے آمادہ رہتی ہے۔

بہر یک گل خزاں صد گلشن کند

نسیم صبح اگر ایک طرف پھول کے شیرازہ کو بکھیرتی ہے تو دوسری طرف غنچۂ گل کو نکھارتی اور اس کی شیرازہ بندی بھی کرتی ہے۔ اور اس کی چابک دستی اور ہمہ بینی بھی غضب کی ہے کہ ایک ساتھ ہی دونوں کام انجام دے رہی ہوتی ہے۔ ع

از نسیم گل پریشاں غنچہ خنداں مے شود

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بناؤ اور بگاڑ کا عمل ایک طے شدہ اسکیم کے ماتحت ہر لمحہ جاری رہتا ہے اور کارگہِ حیات میں اسی چیز کو زندہ رہنے کی اجازت ملتی ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہوتی ہے اور جو چیز فطرت کے مطالبات تسلیم کرنے سے گریز کرتی ہے اس کو اس حالت میں باقی رکھنا فطرت کے مقاصد کے سراسر منافی ہے۔ اور اس حالت میں اس کے لیے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر کے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے قابل بنائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو فنا و عدم کے حوالے کر دے۔ فطرت کا اٹل قانون ان دو صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

انسانی جماعات بھی فطرت کے اس ہمہ گیر قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یہاں بھی وہ بہتر سے بہتر انسانوں کو چھانٹنی اور اصلح و انفع کی طلب و جستجو میں مصروفِ کار رہتی ہے۔ اور جب کوئی جماعت فطرت کے اعلیٰ اصولوں سے منحرف ہو کر فساد کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے اور اس کے اس انحراف و بغاوت سے اس کا جوہرِ انسانیت زنگ آلود ہو کر اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھتا ہے تو اس حالت میں خالقِ کائنات کی طرف سے اس زنگ خوردہ جوہر کو جلا دینے کے لیے نبوت و وحی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ جب کسی قوم میں خدا پرستی کی روح مردہ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو اس وقت خدا کے پیغمبر اس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں اور وہ اس قوم میں از سرِ نو خدا پرستی کی روح پیدا کر کے اس کے اجزاءِ زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَ
أَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ
النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید)

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل بینات کے ساتھ
بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان اتاری تاکہ
لوگ نقطۂ اعتدال پر کھڑے ہو جائیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت قوموں کے شعور فہمی کو بیدار کرنے اور ان کی اصلاح و تعمیر کی آخری کوشش ہوتی ہے اور جب کوئی قوم نبی کی دعوت کو قبول کر کے اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تو اس کے لیے زندگی کی تمام راہیں کھول دی جاتی ہیں اور اگر وہ انکار و انحراف کی راہ اختیار کرتی ہے تو اتمام حجت کے بعد قدرت اس کو مختلف آزمائشوں مثلاً قحط سالی، فقر و فاقہ، تباہ کن وبا اور باہم قتل و خوں ریزی سے سرزنش کرتی ہے کہ شاید یہ رنج و مصیبت ہی اس کو راہِ حق کی طرف متوجہ کر سکے۔ لیکن جب اس انتباہ کے بعد بھی وہ اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرتی تو پھر قدرت اس کو ایک عرصہ تک بے لگام چھوڑ دیتی ہے تاکہ اس کی غلط کاریوں اور معصیت کوشیوں میں جو کمی رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہو جائے اور ٹھیک ٹھیک وہ حالت پیدا ہو جائے جو کسی قوم کی مکمل تباہی کے اسباب فراہم کرتی ہے اور پھر یک لخت ہی اس کے ناپاک وجود سے زمین کو پاک کر دیا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِنْ قَبْلِكَ ،
فَأَخَذْنَاهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ
يَتَضَرَّعُونَ ۔ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا
وَلَٰكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا
فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً
فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ۔ (الانعام)

ہم نے آپ سے پہلی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے (ان کے
انکار پر) ہم نے ان کو تنگیٔ معیشت اور مرض کے ساتھ
پکڑا تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ پس کیوں نہ عاجزی
اختیار کی انہوں نے جب کہ آیا ان پر ہمارا عذاب۔
لیکن (بات یہ ہے) کہ ان کے دل سخت ہو چکے تھے
اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں
خوبصورت بنا دیا تھا، پس جب وہ اس چیز کو بھول
گئے جس سے ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر

ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ اِترانے
لگے تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا، پس وہ مایوس ہو گئے۔

سطورِ بالا سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوموں کی اصلاح اور دعوت و اقامتِ دین کا کام صرف حضرات انبیاء ہی کے لیے مخصوص ہے اور نبی کے سوا کوئی دوسرا شخص یا گروہ یہ کام کرنے کا مجاز ہی نہیں ہے۔ شاید اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں اور وہ براہِ راست خدا کی باتیں اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ جو لوگ نبی کی زندگی میں دعوتِ حق کو قبول کر کے جان و مال سے اس کی حمایت و تائید کرتے ہیں، نبی کے اُٹھ جانے کے بعد وہ نبی کے جانشین ہوتے ہیں اور نبی کا کام اب ان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور پھر ان پیروانِ دعوتِ نبوی کے ذریعے جو لوگ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں ان پر یہ گراں بار ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے، وھلم جرًا۔ یعنی یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ میں ایک ایسا گروہ موجود رہے جو مخلوقِ خدا کو خدا پرستی کی دعوت دے اور احیاء و اقامتِ دین کی جدوجہد کرے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آیۃ)	تم میں ایک ایسا گروہ موجود ہونا چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔

اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد یہ ہے:

لا تزال من امتی امۃ یقاتلون علی الحق۔ (رواہ ابوداؤد)	میری اُمت میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ رہے گا جو حق کے لیے جہاد کرتا رہے گا۔

نیز یہ بات بھی خوب سمجھ لی جائے — اس لیے کہ آج اس کی بیحد ضرورت ہے — کہ جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا انکار کرنے والے لوگ عذابِ الٰہی[1] کے مستوجب بنتے ہیں اسی طرح اس

---

[1] رسول جب آتا ہے تو اپنی قوم کے لیے ایک فیصلہ کن عدالت بن کر آتا ہے اور وہ اللہ کے دیئے ہوئے علم کے تحت پورے وثوق سے عذاب کے بارے میں تنبیہ کرتا ہے۔ مگر رسول کے سوا دوسرے مصلحین و مجددین (باقی ۱۹ پر)

فریضۂ دینی کو انجام دینے والے طائفۂ احرار کی سعی اقامتِ دین کے مخالفین اور فسق و معصیت میں ڈوبے ہوئے مجرمین بھی اللہ کی گرفت سے نہیں بچتے۔ بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اہلِ معصیت کے ساتھ وہ لوگ بھی عذابِ الٰہی کی زد میں آجاتے ہیں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مشکلات سے گھبرا کر گوشۂ تنہائی اختیار کر لیتے ہیں اور صرف پیروانِ دعوتِ حق اور ارباب عزیمت ہی اس عذاب سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ملتِ اسرائیل کے ایک ایسے ہی واقعہ کو بطورِ مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْۗءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَىِٕيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۔

(الاعراف - ۲۱)

جب بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ ہلاک کرنے والا یا عذاب میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ دوسرے گروہ (اہلِ عزیمت) نے کہا تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کرنے کے لیے اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ بچ جائیں پس جب وہ لوگ تعلیم خدا کو بھول گئے تو ہم نے برائی سے روکنے والے اہلِ حق ہی کو نجات دی اور باقی تمام ظالموں کو خطرناک عذاب کے ذریعہ پکڑ لیا۔ اس لیے کہ وہ نافرمان تھے۔

گذشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بعثتِ انبیاء کا مقصد انسانی فطرت کے حقیقی تقاضوں کی تکمیل ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی فطرت کے تقاضے کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کی تکمیل سے پورے نہیں ہوتے بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی کی تکمیل سے پورے ہوتے ہیں اس لیے پیغمبرانہ دعوت زندگی کی کسی ایک ہی سمت میں نہیں بلکہ فکر و عمل کے ہر پہلو کی طرف رخ کرتی، حیاتِ انسانی کے منتشر اور پراگندہ اجزاء میں ربط و تنظیم پیدا کرتی اور مستقل اقدارِ حیات کی اساس پر از سرِ نو زندگی کی تعمیر کرتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ اقامتِ دین کا کام جس درجے کے کمال کے ساتھ انجام دیتے ہیں اور جس درجے میں قوم پر اتمامِ حجت کر جاتے ہیں اس کے مطابق نتائج برآمد ہوتے ہیں اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ حق کو ٹھکرانے والی قوم کیلیے

(ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰)

دعوتِ نبوی کا دورِ اوّل کارِ نبوت کے عام تصور کو جاننے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ جدوجہد سے چھٹی صدی میں جو آفاق گیر انقلاب رونما ہوا اس کا اسلوب کار کیا تھا اور آنحضرت صلعم کو اس کی تکمیل میں کن کن مراحل سے گذرنا پڑا تھا، نیز یہ کہ اس انقلاب کی نوعیت کیا تھی؟

پیغمبرانہ دعوت کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ قلب و نظر کی پراگندگی کو سلجھا کر اس کو علم و یقین سے آراستہ کرتی ہے، یعنی پہلے مرحلہ پر وہ انسانی ذہن کو باطل تصورات زندگی سے پاک کر کے اس کو ایک پاکیزہ اور بلند تر مقصد سے روشناس کرتی اور پھر اس مقصد کے لیے اتنی گہری عقیدت و محبت اور غیر متزلزل یقین پیدا کرتی ہے کہ وہ مقصد پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے اور زندگی کی ہر خواہش اس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے، درحقیقت یہ جذبۂ دروں، صدق و اخلاص اور سوز و دروں پیغمبرانہ دعوت کا پہلا ثمرہ ہے اور جب تک یہ پیدا نہ ہو انسان کے لیے اس دشتِ جنوں میں قدم رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ناز پروردۂ تنعم نبرد راہ بدوست عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

یہ جذب و شوق کا وہ مقام ہے جہاں متاعِ جان محبوب کے قدموں پر نثار کرنے ہی سے سکونِ قلب میسر آتا ہے اور جو اس راہ میں قدم رکھتا ہے اس کو اندیشۂ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دینے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔

دل دادم و جاں دادم ایماں دادم سود است دے سود می دانم چیست

یہ حقیقت ہے کہ جب تک دل میں جذبۂ شوق اور ولولۂ عشق پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان اپنے مقصد کی خاطر ایثار و قربانی کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اور نہ اس میں صبر و ضبط کی خوبیں فروغ پاتی ہیں لیکن یہ جذبۂ شوق محض کتاب خوانی اور بے جان نقوش سے ہرگز پیدا نہیں ہوتا، مکتب کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ انسانی دماغ کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ گو یہ کام بھی اپنی جگہ کارآمد ہے مگر حصولِ مقصد کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے تو ضروری ہے کہ آپ جس چیز

کو حاصل کرنا چاہتے ہیں آپ کے دل میں اس کے لیے گہری محبت، غیر متزلزل عزم اور غیر فانی جذبۂ شوق ہو اور یہ چیز علمِ فلاطوں سے نہیں بلکہ جذبِ دروں اور سوز و درد سے حاصل ہوتی ہے ؎

یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

بلکہ کتاب اللہ کے تفسیری نکات و رموز بھی مسائلِ حیات کی گرہ کشائی کے لیے کافی نہیں ہیں تاوقتیکہ کتاب کا حیات بخش پیغام دل کی عمیق گہرائیوں میں اُتر نہ جائے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

حضرات صحابہ کا یہ قول کس قدر پُرمغز اور حقیقت افروز ہے ؟

تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن ہم نے پہلے ایمان حاصل کیا، پھر قرآن پڑھا

آئیے اب دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مرحلہ پر کس طرح سے کام شروع کیا :

سمندر کے تہ نشین ذروں میں کہیں کہیں چمکدار موتی بھی موجود ہوتے ہیں لیکن ان کو حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ یہ غواص ہی کا کام ہے کہ سمندر کی تہ میں پہنچ کر قیمتی جواہر کو باہر نکال لائے۔ اسی طرح انسانی بستیوں کی تاریک فضا میں کچھ جوہرِ قابل بھی ہوتے ہیں جو معمولی صیقل گری سے ماہ و خورشید بن کر چمکنے لگتے ہیں لیکن ان کا انتخاب غواصِ فطرت یعنی ذاتِ نبوت کے سوا ممکن نہیں ہے۔

ایک داعی جب پہلے پہل کام کی ابتدا کرتا ہے تو قدرتی طور پر اس کی نگاہ ایسے اشخاص کی طرف اُٹھتی ہے جو افکار و خیالات کے لحاظ سے دعوت کے مزاج سے کچھ نہ کچھ مطابقت رکھتے ہیں اور داعی کو ان کی نسبت پہلے سے علم ہوتا ہے کہ ان میں قبولِ دعوت کی استعداد موجود ہے۔ اس نفسیاتی احساس ہی کی بنا پر آنحضرت صلعم نے سب سے پہلے مکہ کی بھرپور آبادی میں سے چند اشخاص کو اس قابل سمجھا کہ ان کو اپنی نئی دعوت سے روشناس کریں۔ کسی گذشتہ بحث میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب کی سرزمین میں کم و بیش ایسے لوگ موجود تھے جو ملتِ ابراہیمی کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید پر قائم تھے۔ لیکن چونکہ صدیوں سے ان میں کسی نبی کا ظہور نہ ہوا تھا اس لیے وہ اس دین کی نسبت بہت محدود اور اجمالی علم رکھتے تھے اور وہ کسی داعیٔ برحق کے ظہور کے منتظر تھے۔ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مرحلہ پر ایسے ہی لوگوں کو اپنے قریب لانے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ میں جن حضرات کے نام اربابِ تاریخ وسیر نے قلمبند کیے ہیں ان میں یہ وصف مشترک تھا کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے دعوتِ اسلامی کے ساتھ مناسبت رکھتے تھے۔ ابن اسحاق نے ان حضرات کے اسمارِ گرامی تفصیل سے ذکر کیے ہیں۔ ابونعیم نے دلائل النبوہ میں اس موضوع پر ایک طویل باب قلمبند کیا ہے۔ نیز اصابہ فی احوال الصحابہ اور دیگر کتب سیر میں ان حضرات کی نسبت تفصیلی بحث ملتی ہے۔ ان میں کچھ تعداد ان لوگوں کی ہے جو نبوت سے پہلے آپ سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتے تھے اور ان کو آپ کی پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کا تجربہ ہو چکا تھا۔ مثلاً حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجۂ محترمہ تھیں، حضرت علیؓ آپ کے تربیت یافتہ تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے مخلص دوست تھے اور حضرت زیدؓ آپ کے غلام تھے، سب سے پہلے ان حضرات ہی نے اسلام قبول کیا۔ اور کچھ تعداد اُن لوگوں کی تھی جو پہلے سے حق کے متلاشی تھے۔ مثلاً عثمانؓ بن مظعون اسلام لانے سے پہلے ہی خدا پرست تھے اور شراب چھوڑ چکے تھے، حضرت ابوذر غفاری جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر ہے اسلام لانے سے پہلے بت پرستی ترک کر چکے تھے اور ایک خدا کی عبادت کرتے تھے۔ صہیبؓ، عبداللہ بن جدعان کے زیرِ تربیت رہ چکے تھے، جو اسلام سے پہلے وفات پا چکے تھے اور انہوں نے اپنی صوابدید سے مے نوشی ترک کر دی تھی۔ سعیدؓ اپنے والد زید کی صحبت میں رہ چکے تھے اور زید نے دین ابراہیمی کی تلاش میں شام کا سفر کیا تھا اور وہاں یہودی و عیسائی علماء و مشائخ سے ملے تھے لیکن ان کو کسی سے اطمینان قلب نہ ہو سکا تھا۔ حضرت اسمارؓ بنت ابی بکر روایت کرتی ہیں کہ میں نے زید کو اس حال میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے ہوئے تھے اور لوگوں سے کہہ رہے تھے "اے قریش تم میں سے کوئی شخص بجز میرے ابراہیمؑ کے دین پر نہیں ہے"۔ (بخاری)

اِس ابتدائی دور میں دعوت کا کام مخفی طور پر انجام پاتا رہا اور جن لوگوں میں قبول حق کی استعداد تھی وہ خود ہی بارگاہِ رسالت میں کھچے چلے آتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ ایمانی ان کے دلوں میں رعشۂ سیماب اور بجلی کی سی تڑپ پیدا کر دیتی تھی، جو ایک دفعہ حلقہ بگوش

رسالت ہو جاتا تو دنیا بھر کی اذیتیں اور طعنے اور تحریص و ترغیب کے تمام اسباب و وسائل اس کے قدم میں لغزش پیدا نہ کر سکتے تھے۔

دعوتِ اسلامی کا دورِ اوّل سالکانِ راہِ حریت و تشنگانِ بادۂ احدیت کے لیے سخت صبر آزما تھا۔ قریش نے ان کی ایذا رسانی کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے اور بے یار و مددگار مسلمانوں پر اتنا تشدد کیا کہ جبر و تشدد کی پوری تاریخ اس کے سامنے ہمیشہ شرمسار رہے گی۔ کسی کو دوپہر کی شعلہ بار دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر اس کے سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، کسی کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا کر اس کی چھاتی پر پاؤں رکھ دیے جاتے، کسی کو جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر اس قدر پیٹا جاتا کہ وہ بیہوش ہو جاتا، کسی کو رسّی سے باندھ کر گلی کوچوں میں گھسیٹا جاتا اور کچھ ان میں ایسے جانباز بھی تھے جنہوں نے سفاک دشمن کے ہاتھ سے یہ کہتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

جان اپنی نثار کر ڈالی یہی لے دے کے ایک کام کیا

یہ داستانِ جور و ستم بہت طویل ہے لیکن چند حرف آپ ان اسیرانِ بلا ہی کی زبانی سن لیجئے۔

قَالَ عُتْبَةُ ابْنُ غَزْوَانَ لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَإِنِّي سَابِعُ سَبْعَةٍ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَنَا طَعَامٌ إِلَّا وَرَقُ الشَّجَرِ حَتَّى تَقَرَّحَتْ أَشْدَاقُنَا فَالْتَقَطْتُ بُرْدَةً فَقَسَمْتُهَا بَيْنِي وَبَيْنَ سَعْدٍ فَمَا مِنَّا مِنْ أُولٰئِكَ السَّبْعَةِ إِلَّا وَهُوَ أَمِيرُ مِصْرٍ مِنَ الْأَمْصَارِ وَسَتُجَرِّبُونَ الْأُمَرَاءَ بَعْدَنَا۔

(اخرجه الترمذی فی الشمائل)

عتبہ بن غزوان کہتے ہیں میں نے اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھا (اس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ساتواں مسلمان تھا) کہ ہمارے پاس درختوں کے پتّوں کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، یہاں تک کہ ہمارے جبڑے زخمی ہو گئے تھے، پس میں نے ایک چادر پائی، اور اس کو اپنے اور سعد میں تقسیم کیا۔ لیکن اب ان سات مسلمانوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی مصر کا حاکم نہ ہو اور ہمارے بعد آنے والے امراء کا تم جلد ہی تجربہ کرو گے۔

حضرت خباب نے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ کفار کے

جبر و تشدد کی انتہا ہو چکی ہے۔ آپ نے جس نصرتِ الٰہی کا ہم سے وعدہ فرمایا تھا وہ کب آئیگی؟ اس مظلوم مسلمان کی مضطربانہ فریاد سے آنحضرت صلعم کو یقیناً رنج ہوا ہوگا لیکن اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا جو آپ نے اس موقع پر دیا:

قَالَ كَانَ الرَّجُلُ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُ لَهُ الْأَرْضُ فَيُجْعَلُ فِيهِ فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيُشَقُّ وَمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِينِهِ وَيُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لَحْمِهِ مِنْ عَظْمٍ وَعَصَبٍ وَمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِينِهِ۔ وَاللّٰهِ لَيُتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلَى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللّٰهَ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ۔ (اخرجہ البخاری)

فرمایا تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گذرے ہیں کہ زمین میں گڑھا کھود کر ان کو اس گڑھے میں گاڑ دیا جاتا اور پھر ان کے سر پر آرا رکھ کر ان کو چیر دیا جاتا تھا لیکن یہ آزمائش ان کو راہِ حق سے پھیر نہ سکتی تھی۔ ان کے جسم میں لوہے کی کنگھی کے دندانے اس طرح چبھوئے جاتے تھے کہ وہ گوشت سے نیچے اتر کر ہڈیوں اور پٹھوں میں دھنس جاتے تھے لیکن یہ مصیبت بھی ان کو حق سے نہ ہٹا سکتی تھی۔ خدا کی قسم اسلام غالب ہو کر رہے گا یہاں تک کہ سوار صنعا سے حضر موت تک تنہا چلا جائیگا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم تو جلد بازی کرتے ہو۔

اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس ابتدائی دور میں اسلام قبول کرنے والوں میں بہت زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو زر و مال اور منصب و جاہ سے محروم تھے۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ آویزشِ حق و باطل کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں حقیقت یہی ہے کہ دعوتِ حق کے مخالفین کی صفِ اول میں جگہ پانے والے اور اہلِ حق پر عرصۂ حیات تنگ کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سوسائٹی میں سیاسی اقتدار یا مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اور یا وہ اصحابِ دولت و ثروت ہوتے ہیں جن کو اپنی وجاہت اور زر و مال کے ضیاع و نقصان کی فکر ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے جن داعیانِ حق کا ذکر کیا ہے ان کو ان جاہ پرست اور خود غرض دنیادار لیڈروں ہی سے سابقہ پڑا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ اپنے چند روزہ جھوٹے اقتدار کے لیے انسانیت

و شرافت کو رسوا کیا اور انسانی تاریخ کا کوئی صفحہ ملوک و سلاطین اور علماء سوء کی سیاہ کاریوں اور دین فروشیوں سے خالی نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ ملوک و سلاطین سے بھی بڑھ چڑھ کر جو لوگ دعوت حق کی مزاحمت اور اہل حق کی تذلیل کرتے رہے ہیں وہ اہل اقتدار کے حاشیہ بردار اور جاہ پرست علماء و مشائخ ہیں جن کی کمینہ سازشوں نے ہمیشہ داعیانِ حق کو رنج و بلا اور قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا رکھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے امام احمد بن حنبلؒ، امام اعظمؒ، حجۃ الاسلام احمد بن تیمیہؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ایسے حق پرستوں کو عمر بھر چین نہ لینے دیا اور حکام وقت سے ساز باز کر کے ان کو قید و بند میں ڈلوایا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ انہی لوگوں کی سیاہ کاریوں کا ماتم کیا اور ان کی سنگ دلی، قساوت قلبی اور دین فروشی پر بار بار ان کو ملامت کرتے رہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ خود اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ دوسروں کو داخل ہونے دیتے ہو"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے۔ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور نجاست سے بھری پڑی ہیں، تم بظاہر لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو"

"اے اندھے رہنماؤ! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو" (انجیل متی)

اور یہ بات کس قدر اندوہناک ہے کہ بالآخر ان حاملانِ شریعت کی ناپاک سازشوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔

"پھر ان کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطس رومی حکمران کے پاس لے گئی اور انہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا۔ پیلاطس نے سردار

کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا، میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے اور چلّا چلّا کر مصر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلّانا کارگر ہوا۔" لوقا ۲۳ : ۱-۲۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ دینی کی ابتدا فرمائی تو اس وقت بھی سب سے زیادہ جن لوگوں نے آپ کی مخالفت میں حصہ لیا وہ مکہ کے اربابِ اقتدار اور مذہبی پیشوا ہی تھے سردارانِ قریش ایک طرف مکہ کی شہری مملکت کے اعضاءِ حکومت یا رؤسائے اعظم تھے اور دوسری طرف عرب کی دینی امامت و پیشوائی کے مدعی تھے۔ مملکتِ مکہ کے مناصب حکومت کی فہرست کے ضمن میں جن لوگوں کے نام درج ہیں ان میں صرف ایک ہی گرامی قدر شخصیت تھی جس نے دعوت کے پہلے مرحلہ پر ہی آنحضرت صلعم کی آواز پر لبیک کہی۔ یہ شخصیت حضرت ابوبکر صدّیق کی ہے جو اسلام لانے سے پہلے مکہ اسٹیٹ کے شعبۂ مغارم و دیات کے مختارِ اعلیٰ تھے۔ اور دوسرے درجہ میں حضرت عمرؓ ہیں جو ۶ نبوی میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، اور اسلام سے پہلے شعبۂ سفارت و منافرت کے اختیارات ان کے سپرد تھے اور پھر حضرت عباسؓ ہیں جو دعوت کے تیسرے دور میں مسلمان ہوئے اور بعثتِ نبوی کے وقت منصب سقایہ پر فائز تھے۔ اِن حضرات کے علاوہ جتنے اربابِ حکومت و اقتدار اور شہر کے روسائے اعظم تھے وہ آخر دم تک دعوتِ اقامتِ دین کی مخالفت میں سرگرمِ کار رہے۔

تیسرے دور میں یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ یہودی سرمایہ دار اور ایران و روما کی امپیریلسٹ طاقتیں اسلام کے لیے مستقل خطرہ بنی رہیں۔ لیکن زمانۂ خلافتِ راشدہ کے بعد ایرانی و رومی امپیریلزم اور یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان کی جگہ خود امّتِ مسلمہ کے ملوک و سلاطین اور علماء و مشائخ نے پُر کر دی اور اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اصحابِ تجدید دین اور علمبردارانِ دعوتِ حق کے مقابلہ میں یہی لوگ ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اسلام کے مایۂ صد فخر محدث حضرت عبداللہ بن مبارک نے ایک ہی شعر میں پوری بات کہدی ہے ؎

وھل افسد الدین الا الملوک واحبار سوء ورھبانھا

اور کیوں نہ واشگاف الفاظ میں کہہ دیا جائے کہ آج بھی یہی دو طبقے ہیں جو نہ صرف تحریک دعوت و اقامت دین کی مخالفت میں پیش پیش ہیں، بلکہ انہوں نے اسلام کی آڑ میں اسلام ہی کی شکست و ریخت کی مہم جاری کر رکھی ہے ؎

ریزہ ریزہ از سنگ او مینائے او آہ از امروز بے فردائے او

بات بہت دور جا نکلی ہے، مقصد یہ تھا کہ دعوت کے دورِ اول میں جو لوگ قبولِ دعوت کے بعد جماعت میں شامل ہوتے تھے آنحضرت صلعم کامل توجہ سے ان کے دلوں میں اسلامی نصب العین کی لگن پیدا کرتے اور اس مقصد کی راہ میں پیش آنے والے آلام و مصائب پر صبر و ضبط کی تلقین فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے مکی دور میں جس قدر قرآنی سورتیں نازل ہوئیں ان میں صرف اسلام کے اعتقادی مسائل سے بحث کی گئی ہے اور اس کے ساتھ بار بار مسلمانوں کو عفو و بردباری اور تحملِ شدائد کی ہدایت کی گئی ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (آیہ)	اے پیغمبر! آپ نیکی کے ذریعہ (برائی کی) مدافعت کریں
فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ (آیہ)	پس تم معاف کرو اور پہلو تہی کرو، یہاں تک کہ اللہ کوئی حکم دے۔
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (آیہ)	جو صبر کرے اور معاف کرے پس یہ عزم الامور سے ہے۔
وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (آیہ)	اور اگر تم صبر کرو گے تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں مسلمانوں کو عفو و درگذر اور مصائب پر صبر و استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان احکام کی حیثیت مستقل پالیسی کی نہ تھی بلکہ دعوت کے مرحلۂ اول پر مسلمانوں کے لیے صبر و تحمل کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا، کیونکہ ایک تو مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے

برابر تھی اور دوسرے مسلمان کا کوئی تنظیمی مرکز نہ تھا۔ اور درحقیقت ان آیات میں دعوت کے مرحلۂ اوّل کے لیے یہ اصول متعین کر دیا گیا ہے کہ جب بھی داعیانِ حق کو ان حالات میں اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینا پڑے تو قوت و طاقت فراہم ہونے تک وہ دشمن کی زیادتیوں کو برداشت کریں اور ان کے مقابلہ میں ہاتھ نہ اٹھائیں، اور ظاہر ہے کہ دعوت و اقامتِ دین کا فریضہ اس عہد کے لیے ہی مخصوص نہ تھا بلکہ تاقیامت جاری رہنے والا ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر مفسرین نے حد ہی کر دی ہے کہ انہوں نے جہاد کی آیاتِ مطلقہ سے ان تمام آیات کو منسوخ قرار دے دیا ہے جن میں عفو و درگذر کا حکم دیا گیا ہے یا جن میں مشروط طور پر جہاد و قتال کی اجازت دی گئی ہے۔ ان حضرات نے نہ جانے کیسے یہ تصور کر لیا ہے کہ تحریکِ دعوت و اقامتِ دین کے لیے اس قسم کے حالات قیامت تک پیش ہی نہ آئیں گے؟

بات یہ ہے کہ داعیانِ حق کو دعوت کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر انتہائی مرحلہ تک مختلف حالات سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جو پالیسی دعوت کے ابتدائی مرحلہ کے لیے موزوں ہو وہ بعد کے ادوار کے لیے بھی کارآمد ہو سکے۔ لیکن جب کسی زمانہ میں از سرِ نو ویسے ہی حالات درپیش ہوں جو دعوت کے ابتدائی مرحلہ پر پیش آتے ہیں تو اس وقت ان قرآنی آیات ہی سے روشنی لی جا سکتی ہے جن کو ہمارے مفسرین نے منسوخ قرار دے دیا ہے[1]۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ قرآنِ حکیم نے دعوت کے ابتدائی مرحلہ کے لیے عفو و صبر کو بطور ایک اصول کے پیش کیا ہے رسولِ عربی صلعم اور آپ کی امت ہی سے مخصوص نہیں، بلکہ آپ سے پہلے کے انبیاء و رسل بھی اس اصول کی پابندی کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ واضح مثال حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے۔ چونکہ حضرت مسیح کو بھی ایسے ہی حالات سے سابقہ پڑا تھا کہ ایک طرف رومیوں کی ظالمانہ حکومت تھی اور دوسری طرف یہود کے فتنہ پرور پیشوایانِ مذہب! اس لیے انہوں نے اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دی تھی:۔

[1] میں نے اپنی کتاب "اسلام کا نظریۂ جہاد" میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔

"جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے، دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اگر کوئی نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اُس کے حوالے کر دے۔" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

لیکن حضرت مسیح کے بعد میں آنے والے پیروؤں نے یہ سمجھ لیا کہ عدمِ تشدد حضرت مسیح کا مستقل عقیدہ و مسلک اور دینِ مسیحی کا جزوِ اعظم ہے اور ان کے اتباع میں مسلمانوں کا سوادِ اعظم بھی اسی غلطی میں مبتلا ہو گیا۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی اور صاف تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جن حالات میں دعوتِ اقامتِ دین کا بیڑہ اٹھایا تھا ان میں وہ اس سے زیادہ کہہ ہی کیا سکتے تھے؟ اگر حضرت مسیح کو کام کرنے کا موقع ملتا اور ان کو دعوت کے ابتدائی مرحلہ سے آگے نکلنا نصیب ہوتا تو یقیناً وہ اپنے بلند نصب العین کے لیے تلوار بھی اٹھاتے۔ چنانچہ حضرت مسیح کے اقوال ہی سے اس کا ثبوت ملتا ہے :-

"یہ نہ سمجھو کہ میں صلح کرانے آیا ہوں، صلح کرانے نہیں آیا بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔" (متی ۱۰: ۳۴)

دورِ اوّل میں آنحضرتؐ کا دعوتی لائحہ عمل | یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ کارِ نبوت کا حقیقی منشا پوری انسانی زندگی کی شیرازہ بندی ہے یعنی ایک نئے نظامِ فکر اور جدید فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر ایک نئے نظامِ سیاست و تمدن کی عمارت اٹھانا اور اس کے مختلف اجزاء میں نظم و ترتیب پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کا یہ طریقہ سراسر غلط ہے کہ فسادِ انسانیت کے اصل سرچشمہ کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور مختلف سمتوں کو بہنے والی نالیوں کے آگے بند باندھنا شروع کر دیا جائے یا فکر و عمل کے شجرۂ خبیثہ کی جڑ ولی کی زمین میں بدستور گڑی رہنے دے اور اس کی شاخوں کی قطع و برید شروع کر دی جائے۔ یہ راہِ عمل آج تک کبھی صحت مند اور کارآمد نتائج نہیں پیدا کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔ صحیح اور معقول طریق کار یہ ہے کہ اصل منبعِ فساد کو روکا جائے اور مرضِ انسانیت کے حقیقی سبب کی ٹوہ لگائی جائے جس سے نت نئے عوارض رونما ہوتے ہیں۔

دراصل یہ منبعِ فساد جس سے تمام شخصی اور اجتماعی مفاسد پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں انسان

کا حدودِ بندگی سے تجاوز کرنا اور ذاتِ خداوندی کی شانِ کبریائی اور منصب اقتدارِ اعلیٰ میں شریک و سہیم بنا یا بنانا ہے۔ مقامِ بندگی اور مقامِ کبریائی کے حدود و اختیارات کو اگر اپنی اپنی جگہ رہنے دیا جائے تو حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ میں بگاڑ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ معبودیت و الوہیت، حاکمیت اعلیٰ، منصبِ قانون سازی، حاجت روائی، قدرتِ مطلقہ وغیرہ ذاتِ خداوندی کے مختص مقامات ہیں، اور بندہ کا مقام ذاتِ خداوندی کی خالص بندگی اور غیر مشروط اطاعت کرنا ہے اور بس! یعنی ایک تو عبادت و بندگی ایک ہی ذات کے لیے مخصوص ہو اور اس میں کسی دوسرے کو شریک نہ بنایا جائے اور دوسرے اطاعت بھی اسی کی ہو جس کی بندگی کی جاتی ہے۔ یہ بات سراسر غیر معقول ہے کہ بندگی ایک کی ہو اور اطاعت دوسرے کی!

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (سورۂ زمر)

ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری ہے حق کے ساتھ پس آپ اللہ کی عبادت کریں اپنی اطاعت کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ یاد رکھو اطاعت خالص اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ۔ (زمر)

اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں دین (اطاعت) کو اس کے لیے خالص کر کے۔

یہ ثنویت (عبادت اور اطاعت کو الگ الگ کر دینا) درحقیقت منصبِ آدمیت اور مقامِ بندگی کی شکست و ریخت ہے اور اس سے ہرگز بہتر نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ اس لیے دنیا میں صرف وہی اصلاحی یا انقلابی جدوجہد کامیاب ہو سکتی ہے جو اس منبعِ فساد سے آغازِ جنگ کرے۔ اور اسی لیے پیغمبرانہ دعوت ہمیشہ لاالٰہ الا اللہ کے انقلابی نعرہ سے کام کی ابتدا کرتی ہے۔ لیکن یہ نعرہ یونہی بے مغز اور کھوکھلا نعرہ نہیں ہے بلکہ ان تمام اصول و مقاصد کی جان ہے جو اسلامی نصب العین کے لیے مطلوب ہیں اور جو شخص قلبی احساس اور دماغی بصیرت کے ساتھ اس کا

اقرار کرتا ہے۔ اس کی زندگی کا نقطۂ نظر، اس کی اخلاقی قدریں، اس کی معاشرت، اس کی معیشت و سیاست، اس کے بین الملی روابط، اس کی تہذیب و ثقافت، غرض اس کی پوری زندگی ایک نئی سمت کو پھر جاتی ہے۔

در جہاں آغازِ کار از حرفِ لاست این نخستین منزلِ مردِ خداست
ملتے کز سوزِ او یک دم تپید از گلِ خود خویش را باز آفرید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعوت کے دورِ اوّل میں اسی نقطہ سے کام کی ابتدا فرمائی۔ تنظیم کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کے اقرار کے ساتھ جماعت میں داخل ہو وہ تمام سابقہ عقائد و افکار اور اعمال و اشغال سے یکسر کنارہ کش ہو جائے ــــ "لا الٰہ" کا مفہوم یہی ہے ــــ اور پھر اپنی پوری زندگی کو خدا اور رسول کے حوالے کر دے ــــ یہ "الا اللہ" کا مفہوم ہے ــــ نیز اس مرحلہ پر یہ بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں اس مقصد کے لیے صدق و اخلاص اور سوز و عشق پیدا کیا جائے تاکہ وہ خاندانی رشتوں کو چھوڑنے اور راہِ حق میں بڑی سے بڑی قربانی کے لیے مستعد ہو جائیں۔ نگاہِ نبوت نے یہ کام بھی کر دیا اور ان کے دلوں میں کچھ ایسی سیمابی تڑپ پیدا ہو گئی کہ حرکت و بیقراری ہی ان کی زندگی کا قرار بن گئی۔

موجیم کہ آسودگیٔ ما عدمِ ماست ما زندہ از آنیم کہ آرام نگیریم

دورِ نبوت سے پہلے دنیا کی تمام قومیں فکر و عمل کے لحاظ سے روحِ دینی اور ذوقِ حق پرستی سے بالکل محروم تھیں۔ ان کا طرزِ زندگی اور نظامِ تمدن اصولِ دین سے یکسر بے تعلق تھا۔ دین و مذہب معبدوں اور خانقاہوں میں محبوس اور پیشوایانِ مذہب کی ہوسناکیوں کا آلۂ کار تھا۔ گو اہلِ حکومت و اقتدار اور ملک کے عوام زبانی طور پر دینداری کے مدعی تھے لیکن ان کے طرزِ بود و باش اور اندازِ فکر و عمل سے یہ اندازہ کرنا قریبًا ناممکن تھا کہ وہ فی الواقع خدا اور اس کے دین کو مانتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس منافقت اور قول و عمل کے تضاد کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ نیز آپ نے دین کو ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش کیا۔ جو لوگ جماعت میں شامل ہوتے تھے یہ بات ان کے ذہن نشین کر دی جاتی تھی کہ دین جس طرح حیات بعد الممات کے مسائل سے

بحث کرتا ہے اسی طرح وہ انسانی زندگی کے عملی مسائل کو بھی حل کرتا ہے، اور دین کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کو کامل نظامِ حیات کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور اس کے حصے بخرے نہ کئے جائیں۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ (الشوریٰ)

مقرر کیا اللہ نے تمہارے لیے وہ دین جس کے قائم کرنے کا اُس نے نوحؑ کو حکم دیا اور وہ جو وحی کی ہم نے آپ کی طرف اور وہ جو حکم کیا ہم نے اس کے قائم کرنے کا ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو اس مضمون کے ساتھ کہ تم دین کو قائم کرو اور اس میں افتراق پیدا نہ کرو۔ مشرکین پر وہ چیز بہت گراں ہے جس کی طرف آپ ان کو دعوت دیتے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے "کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ" پر غور کیجیے! مشرکین کے لیے کیا چیز مشکل تھی؟ ظاہر ہے کہ "لا الٰہ الا اللہ" کا زبانی اقرار ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ مشکل کوئی چیز تھی تو وہ یہ کہ اس کے منشا و مقصود کے پیش نظر زندگی کے پورے ڈھانچے کو بدل ڈالیں اور بندگیٔ نفس کو چھوڑ کر اپنی زندگی کی باگ ڈور خدا اور رسول کے ہاتھ میں دے دیں۔ صرف یہی چیز تھی جس نے مشرکین کو دعوتِ نبوی کے بالمقابل کھڑا کر دیا۔

دعوتِ نبوی کا دوسرا دور: اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مکی دور کے آغاز میں آنحضرت صلعم نے دعوت کا کام کس طرح شروع کیا اور کن کن لوگوں کو سب سے پہلے دعوت سے متعارف کیا۔ تین سال تک اسی انداز سے کام ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد دعوت کی رفتار اس مرحلہ پر پہنچ گئی کہ آپ کو علانیہ فریضۂ تبلیغ انجام دینے کا حکم ہوا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر) آپ کو جو حکم ملا ہے اس کو واشگاف کہہ دیں۔

اور پھر یہ حکم بھی نازل ہوا

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء) آپ اپنے قریبی خاندان والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں

لیکن دعوت اسلامی جس قدر زور پکڑتی گئی اسی قدر دشمنوں کی مزاحمت اور مظالم کی شدت بھی بڑھتی گئی، اس حد تک کہ ۵ھ نبوی میں کچھ مسلمانوں کو جن میں کچھ ذی اثر اور متمول افراد بھی شامل تھے حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ ۶ھ نبوی میں حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا۔ اب تک مسلمانوں کی تعداد چالیس پچاس کے لگ بھگ تھی، لیکن اب مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا اور مشرکین کو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ اگر اسلام کی رفتار ترقی کا یہی حال رہا تو یہ کچھ دنوں میں سارے عرب پر چھا جائے گا۔ چنانچہ دعوت و تبلیغ کا دوسرا دور شروع ہونے پر مخالفین کے مظالم کا بھی نیا دور شروع ہو گیا۔ کفار نے مشورہ کے بعد حضور کے چچا ابو طالب سے مطالبہ کیا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کو قتل کے لیے ہمارے حوالے کر دیں اور بصورت انکار بنی ہاشم سے مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ پہلی صورت کے لیے ابو طالب تیار نہ ہوئے اس لیے دوسری صورت ہی کو قبول کرنا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ابو طالب، دیگر افراد بنی ہاشم اور گروہ مومنین کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ کفار نے اشیاء خورد و نوش کی بہم رسانی پر پہرے بٹھا دیے اور ان ناکردہ گناہ مسلمانوں نے مسلسل تین سال درختوں کے پتے اور خشک چمڑے کھا کر وقت کاٹا۔ تین سال کے بعد یعنی ۱۰ھ نبوی میں کچھ نیک دل لوگوں (ہشام عامری اور زہیر) کی سعی و کوشش سے مسلمانوں کو اس مصیبت سے رہائی ملی۔ لیکن اسی سال آنحضرت صلعم اپنے شفیق چچا کے سایۂ عاطفت اور اپنی زوجہ خدیجہ الکبریٰ کی رفاقت سے محروم ہو گئے۔ ابو طالب کی موت ایک بہت بڑا سانحہ تھی اور شاید ظاہر بین لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہو گا کہ اب اسلام اور بانیٔ اسلام کا آخری سہارا بھی جاتا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ حق کا کام شخصیتوں کی موت و حیات پر انحصار نہیں رکھتا، جس کا یہ کام ہے اس کے پاس سہاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی سہارا نہ بھی ہو تو بغیر سہارے کے بھی وہ اس کام کو چلا سکتا ہے چنانچہ یہ بات دنیا کے لیے یقیناً تعجب انگیز ہو گی کہ اس سال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلقۂ دعوت کو پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا۔ قرب و جوار کی بستیوں میں جا جا کر لوگوں کو

دعوتِ حقہ سے روشناس کیا اور حج کے موقع پر عرب کے مختلف قبائل کے اعاظم و رؤسا سے ملاقاتیں کیں۔ ابن سعد کی تصریح کے مطابق اس دوران میں آپ تقریباً پندرہ قبائل سے ملے، اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ ان قبائل میں بنو عامر، غسان، حنیفہ، سلیم، بنو نضر، کندہ، عذرہ، حزارہ اور بنو ذہل بن شیبان قابلِ ذکر ہیں۔ نیز آپ عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز کے میلوں میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو حق کی دعوت دیتے تھے۔ مورخین کی تصریحات کے مطابق عکاظ نامی میلہ عربوں میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس میں ہر قبیلہ کے لوگ اپنے جنگی کارنامے اور نسلی مفاخر بیان کرتے تھے، اور بڑے بڑے نامور شعراء اس میں شریک ہوتے تھے، گویا یہ ایک "بین القبائلی ادبی ادارہ" تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دورۂ قبائل کے دوران میں جب قبیلۂ بنو عامر کے پاس تشریف لے گئے تو اس قبیلہ کے فراس نامی ایک جاہ پرست لیڈر نے آپ کی تقریر سن کر کہا "یہ شخص میرا ساتھ دے تو میں پورے عرب کو زیرِ نگیں کر لوں" نیز اس نے کہا "میں اس شرط پر آپ کا ساتھ دیتا ہوں کہ آپ اگر مخالفوں پر غالب آجائیں تو آپ کے بعد حکومت و ریاست مجھے ملے گی" آنحضرت صلعم نے فرمایا "یہ تو میرے بس کی بات نہیں: یہ خدا کا کام ہے وہ جس کو چاہے دے" اس پر اس نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم پورے عرب کی دشمنی مول لیں اور حکومت میں ہمیں کوئی حصہ نہ ملے" (طبری)

اس قسم کا ایک واقعہ دعوتِ نبوی کے تیسرے دور میں بھی پیش آیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ کے آخر یا ۷ھ کے اوائل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک و سلاطین اور رؤسائے قبائل کو جو دعوتی خطوط لکھے تھے ان میں ایک خط ہوذہ بن علی رئیس یمامہ کے نام بھی تھا، اس شخص نے جواب میں لکھا: "آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بڑی اچھی ہیں۔ اگر حکومت میں آپ مجھے بھی شریک بنانے کے لیے تیار ہوں تو میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں" لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو نہیں دیا جا سکتا" (ابن ہشام)

بات یہ ہے کہ اسلام کسی فرد یا جماعت کو حکومت و اقتدار کا حق محض اس نظریہ کی بنا پر نہیں دیتا کہ جو حریت و آزادی کی جدوجہد میں ایثار و قربانی کرے وہی حکومت و سیادت کا اہل تصور کیا جائے۔ اسلام کے نزدیک حکومت و سیادت کی اولین شرط صالحیت ہے۔ یہ شرط جس میں موجود ہو وہی حکومت و امارت کا اہل ہے، لیکن اس کے ساتھ ایثار و قربانی بھی مل جائے تو اس سے استحقاق کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے، نیز ان واقعات سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جو شخص اقتدار کی خواہش لیے ہوئے اسلام میں داخل ہو یا اقتدار کے لیے اقامتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لے، اسلام کی نظر میں اس کے اسلام اور ایثار و قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے مذکورہ بالا واقعات کے ضمن میں ضمنی طور پر آگیا ہے ورنہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے اہلِ علم نا آشنا ہوں۔ جو بات نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہو اس کے لیے کسی دوسری چیز کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے اسلامی جدوجہد کا مقصد واضح الفاظ میں متعین کر دیا ہے۔ اور اس جدوجہد کے بعد اگر زمین کے کسی ٹکڑے میں حکومت اسلامی قائم کرنے کی نوبت آئے تو امارت و سیادت کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اسلامی تصوریات سے قلبی عقیدت اور عملی لگاؤ رکھتے ہیں۔ اور ان کی زندگیوں سے یہ ظاہر ہو کہ وہ فی الواقع اس تصورِ زندگی کو ماننے والے ہیں محض زبانی دعویٰ اس مقصد کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے۔

غرض دعوت کے پہلے دور کی نسبت سے دوسرے دور میں جن امور کا اضافہ ہوا وہ یہ ہیں:-

(۱) دعوت کا کام پہلے رازداری سے ہوتا تھا اور اب علانیہ شروع ہو گیا۔

(۲) پہلے تبلیغ و دعوت کی نوعیت انفرادی تھی اور اب اس نے اجتماعی اور عوامی رنگ اختیار کر لیا۔

(۳) تحریک کی عمومیت کے پیشِ نظر ان مسائل سے تفصیلی بحث کی گئی جو دینِ ابراہیمی اور یہود و نصاریٰ کے مذاہب میں بنیادی حیثیت رکھتے تھے، لیکن ان مذاہب کے پیروؤں نے ان

کی نوعیت بالکل بدل دی تھی۔ ان مسائل کو نئے نئے اسالیب بیان اور فطری طرزِ استدلال سے ثابت کیا گیا۔

مکی دَور کی یہ خصوصیت ہے کہ اِس میں جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان کے دل ہر قسم کی دنیاوی آلائشوں سے پاک تھے اور وہ حق کو حق سمجھ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے کیونکہ اِس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ یہ لوگ ابتلاء و آزمائش کی بھٹی میں پڑ کر نکھر چکے تھے اور اس لیے ان کی ایمانی طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں پر بھاری تھا۔

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۔ (انفال-۹)	اگر تم میں بیس صبر کرنے والے آدمی ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب آئیں گے۔

اِن لوگوں کی تیز بیں اور حقیقت شناس نگاہ نے اسلامی اصول و تصورات کے ذہنی نقشہ کی مدد سے مستقبل کا عملی نقشہ مشاہدہ کر لیا تھا لیکن جو لوگ دعوت کے تیسرے دَور یعنی تاسیسِ مملکت اور نظامِ اسلام کے قیام و نفاذ کے بعد مسلمان ہوئے ان کے سامنے اسلام کا عملی نقشہ آچکا تھا اور اِس سے پہلے ان کی نگاہ اسلام کے درخشاں مستقبل کو نہ دیکھ سکی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے علم و عمل میں کتنا عظیم فرق تھا؛ یہی وجہ ہے کہ تیسرے دَور میں مسلم اور کافر کا تناسب "ایک اور دس" سے اتر کر "ایک اور دو" رہ گیا تھا۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال)	اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی ہے اور اللہ نے جان لیا ہے کہ تمہارے اندر کمزوری ہے، پس اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے مسلمان ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب آئیں گے۔

دوسرے دَور میں چونکہ دعوت نے عوامی رنگ اختیار کر لیا تھا اس لیے مکی دَور کے اواخر تک اسلام کی آواز دُور دُور تک پھیل چکی تھی، اور کم از کم اس نئی تحریک کے نام سے عرب کے تمام قبائل

(جن میں جنوبی عرب اور شمالی عرب کے قبائل بھی شامل تھے) روشناس ہو چکے تھے۔ حبشہ، مسلم مہاجرین کے ورود کی وجہ سے اسلام کے نام سے متعارف ہو چکا تھا۔ مدینہ منورہ میں مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغ سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو چکی تھی۔

دعوت کا تیسرا دور: یہ دور ہجرت کے بعد شروع ہوا، جبکہ مدینہ منورہ میں اسلامی اسٹیٹ قائم ہوا، ذہنی تصورات پیکرِ مشہود بن کر جلوہ گر ہوئے، عملی سیاسیات سے واسطہ پڑا، معاشی خاکہ بندی کی اسکیمیں مرتب ہوئیں، معاشرت کے اصول وضع ہوئے، پہلی مملکتِ اسلامیہ کا دستور ترتیب دیا گیا، بین الممالک پالیٹکس کے نقشے تیار ہوئے، عدالت کا آئین وضع ہوا، غرض نظامِ کہنہ کا ہر نقش مٹا دیا گیا اور ایک ہمہ گیر اور مکمل نظامِ سیاست و تمدن سے دنیا کو روشناس کیا گیا۔

سوختی لات و منات کہنہ را تازہ کردی کائنات کہنہ را

یہ سب کچھ دیکھ کر دنیا حیران و ششدر رہ گئی کہ جس کو کل تک دیوانہ تصور کیا جاتا تھا اور اس کی قوم نے اس کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا آج صرف عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی مرکزی طاقت اس کے ہاتھ میں آگئی ہے اور اقوامِ دنیا کی قسمتوں کا مالک بن گیا ہے!

تیسرے دور میں تاسیسِ مملکتِ اسلام، آنحضرت صلعم کی سیاست کاری، معاشی خاکہ بندی، نظامِ عدالت وغیرہ مستقل مباحث ہیں اور ہر ایک کو انشاء اللہ الگ الگ عنوان کے ضمن میں زیرِ بحث لایا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

چند نئی مصری مطبوعات

از جناب مولانا مسعود عالم ندوی

(قسط دوم)

(۵) العدالة الاجتماعية فی الاسلام (اسلام میں اجتماعی عدل) مصنف: سید قطب۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ، بڑی تقطیع، ۲۷۰ صفحے۔

یہ کتاب اور اس کا موضوع بحث، محمد الغزالی کی کتابوں اور ان کے موضوع بحث سے ملتے جلتے ہیں مگر دونوں مصنفوں کی شخصیتوں میں بڑا فرق ہے۔ الغزالی، ازہر کے عالم اور قدیم طرز کے تعلیم و تربیت یافتہ ہیں۔ غالباً یورپ کی کوئی زبان وہ نہیں جانتے۔ قدیم تعلیم اور قرآن و حدیث کے مطالعہ کے باعث، مزاج میں اعتدال، طبیعت میں رزانت اور لہجے میں نرمی ہے۔ ان کے برعکس، زیر نظر کتاب کے مصنف سید قطب، جامعۃ کولوراڈو کے گریجویٹ، امریکا پلٹ اور مصر کے نئے لکھنے والوں میں امتیازی شہرت کے مالک ہیں۔ الاخوان المسلمون، یا کسی اور مذہبی انجمن سے ان کا کوئی باضابطہ تعلق نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نے خود انہیں اپنی طرف کھینچا اور آہستہ آہستہ یہ حقیقی اسلام کے مبلغ اور اسلامی تحریک کے داعی بن گئے۔ لیکن چونکہ ان کا یہ جوش و خروش کسی مدرسہ یا دارالعلوم کا مرہونِ منت نہیں، اور نہ ان کے دل میں علمائے کرام کا کوئی روایتی احترام ہی ہے، اس لئے قدرتی طور پر خامیوں اور غلطیوں پر ان کی تنقید سخت اور تلخ ہوتی ہے۔

کتاب کا موضوع اجتماعی عدل سے متعلق اسلام کی تعلیم، پروگرام، اور اس کے ارکان و وسائل سے

ہمارے سامنے اس وقت کتاب کا دوسرا منقح ایڈیشن ہے، جو مصنف نے پچھلے دنوں امریکا سے واپسی پر شائع کیا ہے۔ پہلا ایڈیشن بغداد میں راقم کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اس ایڈیشن میں مفید اضافے ہیں۔ امریکا کی ایک علمی سوسائٹی اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر رہی ہے۔

بحث کرتا ہے۔ مصنف کو اسلام اور اس کی تقدیر (Destiny) اور روشن مستقبل پر یقین کامل ہے۔ کمیونزم اور جمہوریت، دونوں سے وہ نالاں ہیں۔ ان کی نگاہ میں دونوں مادہ پرست اور دین اور دینی فکر کے دشمن ہیں۔ روس اور امریکا کی باہمی رسہ کشی، جنگِ زرگری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ (ص ۲۶۳)۔

کتاب کے اہم ابواب یہ ہیں:۔

(۱) مسیحیت اور اسلام میں دین اور سوسائٹی کی حیثیت

(۲) اسلام میں اجتماعی عدل کا مزاج

(۳) اسلام میں اجتماعی عدل کے ارکان۔ (الف) قلب و روح کی آزادی۔ (ب) انسانی مساوات (ج) اجتماعی تضامن و تکافل۔

(۴) اسلام میں اجتماعی عدل کے وسائل۔

(۵) اسلام میں حکومت کا نظام۔ (الف) مالی پالیسی (ب) انفرادی ملکیت (ج) زکوٰۃ کی فرضیت

(۶) زکوٰۃ کے علاوہ مال میں دوسرے حقوق

(۷) اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں۔

(۸) اسلام کا حاضر اور مستقبل

(۹) دوراہے پر

تبصرہ نگار کی نگاہ انتخاب حیران ہے کہ ایسی مفید اور جامع کتاب کا کون سا پہلو نمایاں کرے اور کسے نظر انداز کرے؟ ایک مختصر تبصرے کی محدود گنجائش میں طول طویل اقتباسات دینا مشکل ہے مجبوری میں مصنف کے بعض افکار و رجحانات ہی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

پہلے باب میں فاضل مؤلف نے اسلام اور مسیحیت کا فرق بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ "مسیح علیہ السلام نے اجتماعی یا سیاسی نظام کے متعلق صرف سرسری اشارے فرمائے ہیں۔ مسیحیت نے قیصر کا قیصر کو دیا اور اللہ کا اللہ کو۔ اس کی بنیاد اس تصور پر اٹھائی گئی کہ دین صرف رب اور بندے کے درمیان ایک رابطے کا نام ہے، جس طرح قانون عبارت ہے، حکومت اور فرد کے باہمی تعلق سے۔

لیکن اسلام کا حال اس سے مختلف ہے:۔

"دین کا ایک مجموعہ ہے، جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا (کلّ لا یتجزیٰ)

"عبادت و معاملات و قوانین و ہدایات ۔۔۔ دین سب کے مجموعے کا نام ہے تعبدی شعائر اپنی فطرت و غایت میں سیاسی نظام اور معاملات سے الگ نہیں۔" (ص۳۱)

دوسرے باب میں اسلام کے تصورِ کائنات پر گفتگو کرتے ہوئے، "اسلامی فلسفہ" کے متعلق مؤلف نے پتے کی بات کہی ہے، جس سے ان کی ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے:۔

"ابن سینا یا ابن رشد اور ان جیسوں کے ہاں، جنہیں فلاسفۂ اسلام، کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، صحیح اسلامی فلسفہ کی تلاش بے سود ہے۔ ان کا فلسفہ یونانی فلسفہ کا عکس ہے، جسے حقیقت میں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔" (ص۴۲)

اس سلسلے میں مصنف کو علمائے ازہر سے بھی سخت شکایت ہے:۔

"اسلام کے تصورِ حیات کی تشریح اور دوسرے نظامہائے حیات پر اس کے نظامِ حیات کی برتری ثابت کرنے کے بجائے، کلیتہ اصول الدین میں ابن سینا اور ابن رشد کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ یونانی فلسفے کی نقالی و ترجمانی کو بے جا طور پر اسلامی فلسفہ کا نام دے دیا گیا ہے۔" (ص۴۸)

تیسرے باب سے لے کر چھٹے باب (ص۴۲-۱۴۱) تک مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمارے ہاں کوئی نئی چیز نہیں، لیکن مصر اور عربی بولنے والے علاقوں میں ابھی ضرورت ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت، اجتماعی عدل، مالی پالیسی اور متعلقہ مسائل پر بار بار اور تفصیل سے لکھا جائے۔ مصنف نے یہ فرض بڑی قابلیت اور جامعیت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ کسی مصنف و مفکر کے تمام خیالات سے اتفاق کرنا تو بڑا مشکل ہے، البتہ اس بات کی شہادت دی جا سکتی ہے کہ مصنف کی صائب فکر اور ان کے جذبۂ دعوت کا پڑھنے والے پر خاص اثر پڑتا ہے۔ شخصی ملکیت پر پابندیاں، مال پر زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے واجبات، کنز اور اس کی مقدار، اور اسی طرح کے دوسرے مسائل میں کافی گفتگو اور کسر و انکسار کی گنجائش

ہے۔ اور یہ کام ایک فرد کے کرنے کا ہے بھی نہیں۔ مصر میں یا ہمارے ہاں جو اصحاب علم ان مسئلوں پر لکھتے ہیں، وہ گویا آئندہ منظم کام کے لیے مواد خام اور مسالہ فراہم کر رہے ہیں۔

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے حقوق بھی ہیں۔ اس پر مؤلف نے مفصل گفتگو کی ہے۔ (ص ۱۳۲-۱۴۰) زکوٰۃ کو اسلام کا آخری مطالبہ کہنا مصنف کے خیال میں، پیشہ ور علمائے دین (رجال الدین المحترفین) کی ایجاد ہے:-

"جب جماعت کو زکوٰۃ کے علاوہ دوسری آمدنی کی ضرورت نہ ہو، تو زکوٰۃ "کم سے کم مطالبے" کے طور پر واجب ہے۔ لیکن اگر زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو، تو اسلام بے بس نہیں۔ وہ صاحب امر کو کافی اختیارات دیتا ہے۔ اصلاح کی لازمی حدود کے اندر وہ قوم کے سرمایہ سے مناسب مقداریں لے سکتا ہے" (ص ۱۳۶)

مصنف نے اس سلسلے میں فقہی مصالح مرسلہ اور سد ذرائع پر مفصل گفتگو کی ہے اور محمد ابو زہرہ کی کتاب "الامام مالک" سے طویل اقتباسات دیئے ہیں۔ ائمہ اربعہ میں امام مالک ہی مصالح مرسلہ کے باب میں معتدل رائے رکھتے اور نص نہ ہونے کی صورت میں اس کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس باب میں وہ مبتدع نہیں، بلکہ ان کے پاس دلائل و شواہد ہیں۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اور خاص طور پر عہد فاروقی کی متعدد مثالیں محمد ابو زہرہ نے دی ہیں۔ مصالح مرسلہ کے ماتحت، صاحب امر کو جو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال ذیل میں درج ہے، جو مصنف نے محمد ابو زہرہ کی کتاب "الامام مالک" سے نقل کی ہے:

"عام ملکی مسائل میں مصلحت کے مؤثر ہونے کی ایک مثال یہ ہے کہ جب بیت المال خالی ہو، یا فوج کی ضروریات بڑھ جائیں، اور بیت المال کا ذخیرہ کافی نہ ہو، تو امام کو حق حاصل ہے کہ وہ مالداروں پر اتنی رقم عائد کر سکتا ہے، جو اس کے خیال میں فوری طور پر ضروریات کے لیے کافی ہو۔ . . . . پھر اسے یہ بھی اختیار ہے کہ یہ ٹیکس فصل کی تیاری اور پھلوں کے پکنے کے وقت عائد کرے، تاکہ اصحاب ثروت کی دل آزاری نہ ہو۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ اگر امام عادل ایسا نہ کرے، تو اس کا رعب و وقار ختم اور ملک دشمنوں کے حملوں کی

آماجگاہ بن جائے گا ـــــ ممکن ہے، یہ کہا جائے کہ ٹیکس عائد کرنے کے بجائے امام بیت المال کے لیے قرض بھی لے سکتا ہے؛ اس کا جواب امام شاطبی نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ "بحران (ازمۃ Crisis) کے عالم میں قرض اس وقت لیا جاتا ہے جب بیت المال میں آمدنی کی توقع ہو۔ لیکن جب کوئی (ایسی) توقع نہ ہو، اور آمدنی کے تمام ذرائع ناکام ثابت ہوں، تو پھر کوئی رقم مشخص کرنے (توظیف) کے سوا چارہ کار نہیں" (ص ۱۳۹)

اسی طرح "سد ذرائع" بھی ایک معتبر فقہی اصل ہے۔ امام ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں آثار صحابہ سے اس کی بیسیوں نظیریں پیش کی ہیں۔ مؤلف کے خیال میں مصالح مرسلہ اور سد ذرائع کے اصولوں کے ماتحت سوسائٹی کی تمام معاشی مشکلات حل کی جاسکتی ہیں۔ طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ اس کی مثالیں دی جاتیں۔

ساتواں باب (اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں) کتاب کا سب سے طویل اور اہم باب ہے۔ اس میں مولف نے اسلام کی تاریخ اور فکری تغیرات کا جائزہ لیا ہے اور شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کے عہد خلافت سے لے کر دورِ حاضر تک کی فکری اور عملی تبدیلیوں پر نظر ڈالی ہے۔ مصنف نے دائرے میں لگی لپٹی نہیں لکھی۔ جو کوئی اسلامی روح کا پیکر اور اس کی اصلی خصوصیات کا حامل نظر آیا۔ اس کے حق میں کلمۂ خیر سے بخل نہیں کیا گیا۔ اور جو اس راہ سے ہٹا ہوا دکھائی دیا اس پر نقد کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہوئی۔ جدید تعلیم اور جوشِ جوانی کے باعث ان کا قلم روایتی احترام و عقیدت کا بھی شرمندۂ احسان نہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر بنو امیہ اور خاص کر امیر معاویہ پر انتہائی سخت اور تلخ لہجے میں تنقید کی ہے۔ ان کے خیال میں معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلامی سیاست سے اخلاق کا عنصر خارج کرنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان اور ہند کا اسلام بھی مصنف کے نزدیک مجبوری کے اقرار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور تو اور حضرت عثمانؓ بھی مصنف کی تیغ بیانی سے نہیں بچ سکے ہیں۔ ان کی کوتاہیوں کے لیے عذر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر معاف کرنے کے لیے تیار نہیں

"یہ مشکل ہے کہ ہم حضرت عثمانؓ کی اسلامی روح کو متہم کریں۔ لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ ہم

انہیں اس غلطی سے بھی بری الذمہ قرار دیں۔ بڑھاپے میں ان کا زمامِ خلافت ہاتھ میں دینا، اور بدباطن بنو امیہ کے بداخلاق لوگوں کا ان پر چھا جانا، کوئی معمولی غلطی یا سوءِ اتفاق نہیں" (ص ۱۹۰)

بیت المال میں حضرت عثمانؓ کے سوءِ تصرف کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ یوں تو حضرت عثمانؓ کے باب میں ان کا پورا بیان اور طرزِ تنقید ہمارے نزدیک ناپسندیدہ ہے، لیکن عہدِ عثمانی کے فتنوں کو "روحِ اسلام سے قریب" بتانا (ص ۱۹۰) حد درجہ تکلیف دہ اور افسوسناک ہے۔ فتنہ پردازوں کی شرارتوں سے مؤلف کو انکار نہیں، لیکن وہ ان کے طرزِ عمل کو مروان اور بنو امیہ کے طرزِ عمل کی نسبت اسلام سے زیادہ قریب قرار دیتے ہیں۔ اسلام کا یہ پہلا فتنہ تھا۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ مروان، امیر معاویہ اور یزید کی وکالت کرنا مقصود نہیں، مگر وہ فتنہ، جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کا باعث ہوا، اس کی تحسین و تائید یا اس کی مذمت میں کوتاہی ایک مسلمان کے بس کی بات نہیں ——— کتاب میں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہمیں یہی نظر آئی۔ انشاء اللہ ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جائے گی۔

کتاب میں چھوٹی موٹی خامیاں اور بھی ہیں۔ اور کون مصنف اس سے خالی ہو سکتا ہے؟ طولِ کلام کے خوف سے ہم انہیں نظرانداز کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب بہت مفید، جامع اور وقت کی چیز ہے۔ اللہ کی شان دیکھیے۔ ازہر کے شیوخ تو اپنی تنخواہوں اور گریڈ کی خیر منانے میں سرگرم ہوں، اور دین کی خدمت نئے گریجویٹوں کے حصے میں آئے۔ یہی تضاد ہے جس نے ازہر اور شیوخِ ازہر کے باب میں مصنف کا لہجہ بہت تلخ و تند کر دیا ہے۔

کتاب کی زبان اور اسلوب بالکل اپ ٹو ڈیٹ اور نوجوانوں میں مقبول ہے۔ تبصرہ نگار عربی زبان و انشا میں بھی اعتدال پسند مسلک رکھتا ہے۔ وہ قرآنی زبان اور معیاری اسلوبِ بیان سے انحراف پسند نہیں کرتا۔ لیکن ایک عجمی کی پسند و ناپسند کیا حیثیت رکھتی ہے، جب کہ عربی کے بڑے بڑے مرکزوں میں بھی معیاری زبان لکھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔

معركة الاسلام والراسمالية (اسلام اور سرمایہ داری کی جنگ) مصنف سید قطب، ۱۰۸ صفحے، طباعت اور کاغذ غنیمت۔

یہ جدید مصر کے روشناس اہلِ قلم، سید قطب کی

"تازہ تصنیف اور مصر کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے حامیوں کے لیے دعوتِ مبارزت اور کھلا چیلنج ہے۔ کتاب اول سے آخر تک داعیانہ جوش و خروش کے ساتھ لکھی گئی ہے اور اُن کے لیے جن کے ہاتھوں میں مصری سیاسیات کی باگ ہے، اور اُن کے لیے جو مصر کی دولت و ثروت سے نفع اندوز ہو رہے ہیں، اور اُن کے لیے جو دین کی نمائندگی کے دعویدار اور سرکاری حلقوں میں اس کے ترجمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان سب کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ مصنف کا کہنا یہ ہے کہ "ملک کی موجودہ معاشی و معاشرتی حالت عوام کو کمیونزم کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اگر اس کا جلد سے جلد تدارک نہ کیا گیا، تو صورتِ حال خطرناک ہو جائے گی اور اس کا وبال سیاست کاروں، سرمایہ داروں اور دین کے غلط اور خود ساختہ اجارہ داروں پر عائد ہوگا۔" مصنف نے "إنّی أتّهم" (میں مجرم قرار دیتا ہوں) کے زیرِ عنوان ملک کے ایک ایک گروہ کو للکارا ہے اور ان کی خامیاں اور کوتاہیاں ان کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں اور اس سلسلے میں ایسی حقیقتوں کا انکشاف کیا ہے جنہیں پڑھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

مصری سوسائٹی میں اخلاقی انحطاط کس حد تک پہنچ گیا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

میں مجرم قرار دیتا ہوں! ہاں!! میں موجودہ معاشرتی صورتِ حال کو اس بات کا مجرم قرار دیتا ہوں کہ کوشش، اور بدلہ کے درمیان، توازن، و تناسب کی حیثیت افسانہ سے زیادہ نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ افراد اور جماعتوں میں روز بروز بے اطمینانی پھیل رہی ہے۔ اس میں ہر فرد کے لیے ترقی کے یکساں مواقع ملنا ناممکن ہیں۔ مصر میں یہ کافی ہے کہ لڑکا طفل، بچا نٹ کر اچھے والدین کے ہاں پیدا ہو تاکہ ترقی کی ہر ممکن راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی ہو، اور وہ راہ کی دشواریوں کو اچھلتا پھاندتا طے کرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ اور اگر وہ والدین کا معقول انتخاب نہ کر سکا ہو، تو کم سے کم ایسی بیوی تلاش کرے، جس نے والدین کا اچھا انتخاب کیا ہو اور کسی وزیر یا مالدار آدمی کے گھر پیدا ہوئی ہو، تاکہ شوہر کو اپنے بازوؤں پر لٹکا کر اُڑ جائے۔ اور اگر بیوی بھی والدین کا معقول انتخاب نہ کر سکی ہو، تو پھر اس نے اپنے چہرے کا رنگ و روغن ہی درست کر رکھا ہو (قَدْ أَحْسَنَتْ إِخْتِيَارَ تَقَاطِيعِهَا وَمَلَامِحِهَا)۔ اور یہ وہ نمونہ ہے جس سے

تمام عقدے حل ہو جاتے ہیں اور وہ شخص جس طرح چاہے اسے لے کر حکام کے پاس آ جا سکتا ہے ...... (صفحہ ۲۰-۱۹)

یہ ہے مصر کی موجودہ معاشرت اور ارباب حکومت کا اخلاق جس کے خلاف جوان سال مصنف نے علمِ بغاوت بلند کیا ہے۔

مصر کے ایک روشناس شاعر محمود ابوالوفا کا ایک مزاحیہ قطعہ بھی اس سلسلے میں سن لیجیے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ یہ مذاق نہیں تلخ حقیقت ہے، جو ظرافت کے رنگ میں شاعر کی زبان پر آگئی ہے:-

أَخِيَّ! أَقُلْ لِيَ وَلَا تَخْجَلْ ۔۔۔ بِمَاذَا قَدْ تَرَقَّيْتَا؟

میرے دوست سچ کہنا شرم کی ضرورت نہیں تم نے یہ ترقی کس طرح حاصل کی؟

وَمَا أَنْتَ بِذِي جَاهٍ ۔۔۔ وَعُمْرَكَ مَا تَزَوَّجْتَا

نہ صاحب جاہ و ثروت تھے۔ اور نہ تم نے زندگی بھر شادی ہی کی!!

اللہ اکبر! یہ حالات کہاں نہیں ہیں؟ اللہ کا قانون عدل اندھا بہرا نہیں۔ قوموں کی تباہی یوں ہی نہیں ہوا کرتی۔ خوش نصیب ہیں، جو وقت آنے سے پہلے خبردار ہو جائیں۔

مصنف نے اس سلسلے میں علمائے ازہر کو خوب خوب سنائی ہیں "بد اخلاقیوں اور فواحش کے سیلاب کے خلاف تو علمائے کرام گاہے گاہے بادشاہ سلامت اور وزیر اعظم کی خدمت میں عریضہ گذران دیتے ہیں، لیکن معاشی استحصال اور کسانوں پر جور و ظلم کے خلاف کبھی ان کی زبان نہیں کھلتی۔ یہ بات کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سے ان کے حلوے مانڈے میں فرق آنے کا اندیشہ ہو" (صفحہ ۱۹)

علمائے ازہر کے تصورِ دین پر بھی مؤلف نے جابجا سخت تنقید کی ہے (صفحہ ۶، ۸۰، ۱۲۹، ۱۳۳)۔ نیز علماء اور رجال دین کی طبقہ واری اجارہ داری کی سخت مخالفت کی ہے:-

"علماء اور صوفیوں کے لباس کا بھی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ لباس میں اسلامی اور غیر اسلامی کی تفریق نہیں۔ اسلام نے انسانوں کے لیے کوئی لباس مقرر نہیں کیا۔ لباس

ایک مقامی اور ملکی مسئلہ ہے ۔ تاریخ و روایات سے اس کا گہرا تعلق ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جبہ اور قفطان زیب تن نہیں فرمائے تھے . . . . . .

آخر ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے لباس میں کیوں ممتاز ہو ؟ اسلام میں "رجال دین" کا کوئی منصب نہیں ۔ اور نہ یہاں اہلِ کلیسا کا کوئی خاص طبقہ ہے جس کے توسط کے بغیر مذہبی شعائر ادا نہیں ہو سکتے ۔" (ص ۵۹)

اسی طرح مصر کے موجودہ معاشی نظام کی خرابیوں اور سیاسی پارٹیوں کی اخلاقی کمزوریوں کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے ۔ مصنف کی رائے میں سیاسی پارٹیوں کے باہمی اختلافات صرف وزارتوں اور پارلیمنٹ کی نشستوں کے لیے ہیں ، غریبوں اور مصیبت زدہ طبقوں کے مقابلے میں سب ایک ہیں ۔ (ص ۱۴۵) سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ پرجوش مصنف کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا حل "اسلام" ہے اور اسی لیے وہ بار بار اسلامی نظام حکومت کی برملا دعوت دیتا ہے اور اپنے ہم وطن غفلت کے ماروں کو متنبہ کرتا ہوا کہتا ہے : " اب بھی ہوشیار ہو جاؤ ۔ اگر اسلام کو اختیار نہیں کرتے ، تو پھر کمیونزم کی فتنہ سامانیاں تمہیں تباہ کر کے رہیں گی ۔ یہ غیر فطری صورتِ حال دیر تک قائم نہیں رہ سکتی ۔"

مزید اطمینان کی چیز یہ ہے کہ ابھی مصنف کا آغازِ سفر ہے ۔ توقع ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے قلم سے اور مفید کتابیں نکلیں گی ۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعتدال اور حسنِ عمل کی توفیق دے ۔ ہماری بہترین توقعات ان سے وابستہ ہیں ۔ محمد الغزالی اور ان کے رفقاء کی تالیفات نوجوان طبقوں میں اتنی مقبول اور مؤثر نہیں ہو سکتیں جتنی سید قطب جیسے جدید طرز کے روشناس ادیب کی ۔

(۷) (الف) اسمعی یا مصر ! (اے مصر ! سن !!) چھوٹی تقطیع ، ۱۵ صفحے ۔

(ب) الدعوۃ الاسلامیۃ وتطورات‌ها فی الھند (ہندوستان میں اسلامی دعوت اور اس کی عہد بہ عہد تبدیلیاں) متوسط تقطیع ، ۳۲ صفحے ۔

(ج) اُرید اَن اَتحدث الی الاخوان (میں اخوان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں) ۔ چھوٹی تقطیع ، ۲۹ صفحے ۔

لہ علمائے مصر کا لباس ۔

(د) شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال - چھوٹی تقطیع، ۸۰ صفحے۔

(ھ) المد والجزر فی تاریخ الاسلام - متوسط تقطیع، ۷۶ صفحے۔

طباعت اور کاغذ مصری مطبوعات کی روایات کے مطابق قیمتیں درج نہیں، شاید مکتبۂ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ سے مل سکیں۔ یہ پانچ چھوٹے بڑے پمفلٹ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں مصنف اپنی تبلیغی مہم کے سلسلے میں ایک عرصے سے عرب ملکوں کے دورے پر ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جابجا خطبے بھی ارشاد فرمائے ہیں۔ یہ بیشتر رسالے مصر کے دوران قیام ہی میں لکھے گئے اور وہیں سے چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے مصری مطبوعات کے ضمن میں ان کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

(الف) پہلا پمفلٹ ایک مقالے کے طور پر، قاہرہ کے مشہور ادبی ہفتہ وار رسالہ (الرسالہ) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں مصر کو اس کی مرکزی حیثیت اور اس کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے باتیں اچھی اور دردمندی کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ مگر جس حلقے کا انتخاب کیا گیا ہے، وہاں اس قسم کی سنجیدہ باتوں پر کان دھرنے والے بہت کم ہیں۔

(ب) دوسرا پمفلٹ موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس میں مصنف نے ہندوستان میں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ مگر افسوس کہ سید شہیدؒ کی دعوت تجدید و جہاد کے بعد وہ تحریک کی صحیح تاریخ نہیں بیان کر سکے ہیں۔ مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ) کے بعد ملک کے طول و عرض میں سید شہیدؒ کے ماننے والوں، ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں، اور ان کے مشن کی خاطر گھر بار لٹانے والوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کا اس میں کہیں ذکر نہیں۔ کم سے کم سیرت سید احمد شہیدؒ کے مصنف سے ان کے نیازمند ایسی توقع نہیں رکھتے تھے۔ مزید برآں، دیوبند، ندوہ اور مدیر رسالہ ترجمان القرآن کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف کے نزدیک ایک تعلیمی و تہذیبی تحریک اور اقامتِ دین کی ہمہ گیر دعوت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ آخر میں مولانا محمد الیاس مرحوم کی دعوت و تبلیغ اور ان کی جاذب شخصیت اور ذاتی خصوصیات کا ایک گونہ مفصل اور مؤثر

تذکرہ ہے۔ ہندوستان کی مسلم حکومتوں کو مصنف نے بار بار اسلامی ریاست (الدولۃ الاسلامیہ) اور اسلامی حکومت (الحکومۃ الاسلامیہ) کے نام سے یاد کیا ہے، جو صحیح نہیں۔ غالباً یہ سہوِ قلم کا نتیجہ ہے۔

رسالہ کے آغاز میں مصر کے مشہور مسلمان صاحبِ قلم، سید محب الدین خطیب نے مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ اس مختصر "تعارف نامہ" میں ان کی "ندویت" کی مناسبت سے ان کے اور ہمارے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی اور استاذ الاساتذہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا ذکر بھی آگیا ہے، اور بڑی محبت اور احترام کے لیے ہیں۔

(ج) تیسرے پمفلٹ میں مصنف نے الاخوان المسلمون والوں سے باتیں کی ہیں۔ یہ باتیں اچھی، معقول اور دلنشیں انداز میں کی گئی ہیں، مگر توقع کے خلاف ژولیدگی فکر یہاں اور نمایاں ہے مصر میں اقامتِ دین کے علم برداروں کو لائق مصنف یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ حکومت اور نظامِ حکومت کے قیام کا مطالبہ اسلام میں مطلوب و مقصود نہیں، حکومت، تو اللہ کی طرف سے انعام ہے۔ یہ طلب نہیں کی جاتی۔ کہنا یہی چاہتے ہیں، مگر کہتے ہوئے ڈرتے بھی ہیں۔ اور اسی لیے اس موقع پہ ان کے بیان میں تضاد سا رونما ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ "حکومت طلب نہیں کی جاتی۔ یہ نتیجہ کے طور پر خود بخود ظہور میں آتی ہے، جیسے ایک درخت اپنے وقت پر پھل دینا شروع کرتا ہے"[1] پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"لیکن دعوت کے کسی مرحلے میں — دعوت کے پھیل جانے اور دل و دماغ میں جاگزیں ہو جانے کے بعد — اگر یہ کام حکومت کے بغیر ناممکن ہو، تو ہم دعوت اور دین کی خاطر اس کے لیے جدوجہد کریں گے، جیسے وضو کے لیے پانی کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن اسی ذہنیت اور اسی کردار اور پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ ... الخ الخ۔ (ص ۲۴)

---

[1] ص ۲۱ (ملخص)

ہم گنہگار بھی دعوت کے ایک مخصوص مرحلے ہی پر تبدیلی زعامت وقیادت کی مہم شروع کرنے کے قائل ہیں، اور اسی امانت و دیانت اور خلوصِ نیت و پاکیزگیٔ اخلاق کے ساتھ، جو ایک داعیٔ حق کی خصوصیات ہیں۔ لیکن دعوت کے اصول و مبادی تو اول روز سے واضح اور روشن ہونا چاہئیں۔ پتہ نہیں، ہمارے ملک کے ایک اچھے خاصے ذی علم اور سمجھدار طبقے کے دل و دماغ میں یہ بات کہاں سے سما گئی ہے کہ پاکستان میں تحریکِ اقامتِ دین کے داعی یا مصر میں "الاسلام دین و دولت" کی دعوت دینے والے حکومت کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔ حصولِ جاہ و اقتدار کے لیے حکومت کی طلب یقیناً مذموم اور بدترین چیز ہے۔ لیکن اللہ رب العالمین کے قانون کو جاری و نافذ کرنے کے لیے زمامِ اقتدار صالحین کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنا، اگر اسلام میں مطلوب نہیں، تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام میں کیا چیز مطلوب ہے؟ کیا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی نظامِ حکومت کی داغ بیل ڈالنا نہیں شروع کر دی تھی؟ اور کیا ہجرت کے پہلے ہی سال قریش کے تجارتی راستوں کی ناکہ بندی نہیں شروع کر دی تھی؟ اور مدنی زندگی کے بالکل آغاز میں یہود سے معاہدہ کس لیے ہوا تھا؟ سچ یہ ہے کہ جو حضرات اقامتِ دین کی جدوجہد کو اس پہلو سے صحیح نہیں خیال کرتے، وہ دانستہ یا نادانستہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حکومت و اقتدار جاہ پرستوں اور اقتدار پسندوں کے حوالے کر کے خانقاہ میں اللہ اللہ کرنا ہی عینِ اسلام ہے۔ افسوس کہ زیرِ نظر پمفلٹ میں بھی اسی طریقِ فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔

(د) چوتھا رسالہ ڈاکٹر اقبال پر ہے اور عربی زبان میں اقبالیات پر ایک قابلِ قدر اضافہ۔ لائق مصنف کا متنوع ذوق اور گوناگوں دلچسپیاں لائقِ رشک اور قابلِ داد ہیں۔ اس میں ایک جگہ وہ سر شیخ عبدالقادر مرحوم (مدیر مخزن) کو "الشیخ عبدالقادر" لکھ گئے ہیں، جو علم کی چوک معلوم ہوتی ہے۔ عربی میں "الشیخ" سے مخصوص قسم کے علماء ہی کا تصور ذہن میں آ سکتا ہے۔

(ہ) پانچویں پمفلٹ میں تاریخِ اسلام کے مدوجزر پر اچھے اور دلنشیں انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخِ اسلام کے مختلف ادوار سے عروج و زوال اور اخلاقی مدوجزر، دونوں کے شواہد مستند

واقعات درسِ عبرت کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ رسالہ موضوعِ بحث کے لحاظ سے مختصر، مگر اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

یہ رسالے عربی زبان میں ہیں۔ عربی زبان میں کسی کتاب کا ہونا یوں کوئی تعجب اور خاص اہمیت کی چیز نہیں۔ مگر ان رسالوں کا عربی زبان میں ہونا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف عربی کے مشاق انشاپرداز اور صاحبِ طرز اہلِ قلم ہیں۔ یوں تو برِصغیر پاک و ہند میں عربی جاننے والوں کی کوئی کمی نہیں، مگر لکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ بہرحال اس ملک میں گنتی کے جو دو چار عربی کے مستند اہلِ قلم ہیں، ان میں مصنف کا بھی شمار ہے، بلکہ انہیں اپنے ہم چشموں میں نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اب ان رسائل کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ عرب ملکوں کے مسلسل سفر اور طویل قیام نے ان کی زبان میں مزید جلا پیدا کر دی ہے اور ان کا طرزِ نگارش اور بھی نکھر گیا ہے۔ علی میاں (مصنف اپنے نیاز مندوں کے حلقے میں اسی مختصر اور محبوب نام سے یاد کیے جاتے ہیں) اپنی عام زندگی، معاشرت اور رہن سہن میں تو حد درجہ سادہ بلکہ متقشف واقع ہوئے ہیں، مگر انشاء و تحریر میں وہ اچھے خاصے روشن خیال، اور متجدد (ماڈرن) ہیں، اتنے متجدد کہ ان کے دیرینہ نیاز مندوں کو ان کا یہ تجدد اور روشن خیالی کھٹکتی ہے۔ زبان و انشا میں وہ جدید مصر کے پیرو اور اس کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ مصر کے اکثر نئے لکھنے والوں کی طرح وہ بھی احساس کمتری کے لیے مرکب النقص[1]، اور Against کے لیے ضد[2] استعمال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ Inferiority complex کا ترجمہ "مرکب النقص" بالکل لفظی اور مہمل ہے۔ اسی طرح ضد کے معنی نقیض کے ہیں۔ اس سے Against کا مفہوم کسی طرح ادا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں مثالیں نمونے کے طور پر دی گئی ہیں۔ راقم اپنی زندگی اور معاشرت میں آزاد ہونے کے باوجود ادب و انشا میں بے اعتدالی و آزادی کا حامی نہیں۔ یوں متجددین کی زبان میں اسے قدامت پسندی (محافظت) سے بھی تعبیر

[1] الدعوۃ الاسلامیۃ۔ ص ۲۴

[2] شاعر الاسلام۔ ص ۲

کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک آدھ جگہ پیدائشی "ہندیت" کی پرچھائیں بھی نظر آتی ہے۔ اعوض عن اذنکم (آپ کی اجازت سے عرض کرتا ہوں) جیسا "اردونما" فقرہ علی میاں کے قلم سے نکلنا حیرت انگیز ہے۔ شاید یہ فروگذاشت "بشریت" کی تکمیل کے لیے ہو۔ کہیں کہیں نحوی خامیاں بھی نظر آئیں، مگر ان سے کون بچ سکتا ہے؟

ان دو چار معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر ان رسالوں کی زبان عربی انشا کا اچھا نمونہ ہے اور ایک ہندی نژاد کے لیے قابلِ فخر۔ اور اس کامیابی پر علی میاں، ہماری دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

له التحدث الی الاخوان ص۱۸

مسئلہ تقدیر کا الٹا استعمال

نعیم صدیقی

(قسط دوم)

احکامِ جہاد اور مسئلہ تقدیر: جہاد کے لیے جو خطبات قرآن میں نازل ہوئے ہیں اُن میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جس میں جہاد کے احکام کے ساتھ ساتھ حقائقِ تقدیر نہ بیان ہو رہے ہوں۔ یہ محض اس لیے کہ جہاد کی قربانی پر اطمینانِ قلب کے ساتھ آمادہ کرنے میں ان حقائق کا علم ممد ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ النسا میں جہاں فرمایا کہ "مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ — الخ۔ وہاں دلوں کا چور پکڑا کہ تم شاید موت سے ڈرتے ہو تو سن لو کہ:-

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ — تم جہاں بھی ہو (اپنے وقت مقررہ پر) موت تم کو آلے گی، اگرچہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ پناہ لیے ہوئے ہو۔

دیکھ لیجیے کہ موت کے اٹل تقدیر ہونے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ موت کا خوف دل سے الگ رکھ کے مسلمان فریضۂ جہاد پہ کمربستہ ہو جائے۔

اسی سلسلۂ کلام میں نفاق زدہ لوگوں کی ایک بیماری اور پکڑی کہ وہ "اطاعت رسول" میں اس لیے کوتاہ ہو رہے تھے کہ رسول پر پورا پورا اعتماد نہ تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ إِن تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللهِ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِكَ۔ یعنی کوئی اچھی صورت پیش آئی تو کہا کہ یہ تو اللہ کا کرم ہے اور کوئی تکلیف پہنچی تو رسول پر الزام رکھ دیا کہ اس کی تدبیر ہی ایسی تھی، ہماری رائے پر کام کیا جاتا تو یہ نہ ہوتا۔ ان کو جواب دلوایا گیا کہ "كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللهِ!"

سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے بھلائی ہو یا برائی اُس کا وقوع اللہ کی مشیت ہی کے تحت ہوتا ہے لیکن پھر ایک دوسرے پہلو سے اسی حقیقت کی جھلک یوں دکھائی کہ "جو بھی بھلائی تم کو پہنچتی ہے وہ تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن جو کوئی برائی تم کو لگتی ہے تو وہ تمہارے اپنے نفس کے فساد کا نتیجہ ہوتی ہے" اللہ اسے تمہاری طرف پلٹا دیتا ہے۔

اس نظامِ تقدیر کو بیان کرنے سے سارا مقصد یہ تھا کہ "اطاعتِ رسولؐ کے بغیر اللہ کی اطاعت کے کوئی معنی نہیں۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔

اسی طرح آلِ عمران (آیات ۱۴۳ تا ۱۴۵) میں بھی جہاد ہی کے موضوع پر بات کرتے کرتے موت کے مقدر ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔	اور کسی جان میں یہ تاب نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے جو ایک وقتِ مقرر کے لیے قلمبند کیا گیا ہے

آلِ عمران ہی میں جہاد پر بات کرتے ہوئے منافقین کے اس فتنہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے متعلق یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ لوگ اگر ہماری مانتے اور ہماری طرح ذرا بچ کے رہتے تو مارے نہ جاتے۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں میں انتشار پیدا کرتی تھیں، لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں بھی اپنی تقدیر ہی کا راز بیان کیا کہ

قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیهم القتل الی مضاجعهم	کہدو (اے محمدؐ) کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی رہتے تو وہ لوگ بہرحال اپنی قتل گاہوں کی طرف نکلتے جن کے لیے قتل مقدر تھا۔

یہ کلمات جہاد سے جی چرانے والوں کے فلسفہ کے جواب میں کہہ کر جہاد کا جذبہ رکھنے والوں کی ہمت بندھائی جا رہی ہے۔ تقدیر کا بیان یہاں بھی معصیت سے روکنے اور طاعت پر ابھارنے کے لیے ہے۔

یہی گروہِ منافقین پھر زد پہ آتا ہے۔ اس گروہ کا حال یہ تھا کہ مسلمانوں پر مصیبت پڑے تو

خوش۔ اور ان کو کامیابی ہو تو مغموم! جنگ احد میں جب مسلمانوں کو زک پہنچی تو یہ لوگ بغلیں بجاتے پھرتے تھے کہ دیکھو، ہم عقلمند تھے، میدانِ جنگ میں نہ گئے، اور تم بیوقوف تھے، موت کے منہ میں چلے گئے۔ مسلمانوں میں ان کی ان باتوں کا جو ردِ عمل پیدا ہو رہا تھا اس کو صحیح رُخ پر ڈالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم سے یہ جوابی کلمہ کہلوایا کہ:

لَن یُّصِیبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ج هُوَ مَوْلٰنَا ج وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ٥	ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا بجز اس کے کہ اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہو۔ وہ ہمارا کارساز ہے اور چاہیے کہ اہلِ ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

اس جواب میں طمانیت، مضبوطی، استقامت اور توکل کی کیسی زوردار روح کام کر رہی ہے۔ لیکن کتنے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس سے اُلٹا اپنے لیے بے اطمینانی، تذبذب، ڈھل مل یقینی اور مایوسی اخذ کریں۔

پھر کچھ اور کمزوریاں ہیں جو میدانِ جہاد میں اثر دکھاتی ہیں۔ ان کی طرف "منکم من یرید الدنیا" کہہ کر اشارہ کیا اور میدانِ احد میں اس کمزوری کا مزہ چکھایا۔ پھر اس واقعہ کا ذکر یوں کیا کہ:۔

اذ تصعدون ولا تلوٗن علی احد والرسول یدعوکم فی اخرٰکم فاصابکم غمًّا بغمّ لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما اصابکم	ذرا یاد کرو وہ موقع جب تم (آگے ہی آگے) چڑھے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے، حالانکہ رسول تم کو پیچھے سے پکار رہا تھا، چنانچہ (رسول کو) دُکھ دینے کے بدلے میں تم کو بھی دُکھ پہنچا ۔۔۔ (یہ توضیح اس لیے ہے کہ) نہ تو اُس پر جو ہاتھ سے جاتے اور نہ اُس پر جو پیش آئے کوئی ملال کرو

یعنی اللہ کی اطاعت کرنے والے کو تو نہ مالِ غنیمت کے ہاتھ سے جانے کی پروا ہونی چاہیے اور نہ موت کی نہ زخم لگنے کی، لیکن تم میں چونکہ دنیا پرستی کام کر رہی تھی اس لیے تم تھوڑی دیر کے لیے ابتلا میں آ گئے۔

اسی سلسلے میں یہ بتایا کہ خدا کی نافرمانی اور رسول کی ناراضی کے ساتھ الٹی سیدھی تدبیروں سے

جنگ آزمائی کرنا کس کام کا۔ اور اپنی کثرت پر اترانا چہ معنی، جبکہ فتح کا فیصلہ دراصل اللہ کی تقدیر سے ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم، وان یخذلکم فمن ذالذی ینصرکم من بعدہ، وعلی اللہ فلیتوکل المومنون	اللہ اگر تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تم کو بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد اور کون ہے جو تمہاری مدد کرے۔ اور چاہیے کہ ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

آل عمران ہی کی بڑی مشہور آیت (۲۶-۲۷) جو جبریت کا خزانۂ نکات بن کے رہ گئی ہے، وہ بھی دراصل جہاد اور معرکہ ہائے کفر و دین ہی کے بیچ مومنین کے جذبات کی آبیاری کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝	کہو کہ اے ہمارے اللہ! تو ہی سلطنت کا مالک ہے، تو اپنے دست خیر و برکت سے جسے چاہے ملک (کی باگ ڈور) سونپ دے اور جس سے چاہے ملک (کی باگ ڈور) سلب کر لے، جسے چاہے غلبہ دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے! بلاشبہ تو ہر بات پر قدرت رکھتا ہے تو رات کو دن میں پروتا ہے اور دن کو رات میں پروتا ہے اور زندہ کو مردہ میں سے برآمد کرتا ہے اور مردہ کو زندہ میں سے، اور جسے چاہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے۔

اس آیت میں اہلِ ایمان کو جس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے دشمن اور حق کے مخالفین چاہے کتنے ہی دبدبے اور طنطنے دکھائیں، کتنی ہی جباریوں کا مظاہرہ کریں، کیسے ہی جبارہ بنیں، قوت اور ساز و سامان پر کتنا ہی کبر دکھائیں اِس دنیا کے نظم پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

اصل اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور وہ جب ایک نئی ابھرتی ہوئی اور بظاہر کمزور سی قوت کو اقتدار دینا چاہے تو اس کا راستہ کوئی روک نہیں سکتا اور وہ جس بڑی سے بڑی قوت سے تسلط کا منصب واپس لینے کا فیصلہ کرے ، پھر اس کا کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا ۔ وہ غلبہ رکھنے والوں کو مسندِ نخوت سے نیچے پٹخ دے یا ان کے پیروں میں روندے جانے والوں کو اٹھا کر عزت کے تخت پر بٹھا دے ، کسی کا دانت پیسنا حائل نہیں ہو سکتا ۔ وہ مایوسی اور مصیبت کی تاریکیوں میں سے امیدوں اور کامرانیوں کی صبح کو ابھار کے لاتا ہے اور کفر و شرک کی شبِ تیرہ کے شکم سے ایمان و اسلام کا سورج برآمد کرتا ہے ۔ اور پھر وہی ہے جو متکبرین کے کبراور مترفین کی عیاشیوں اور ظالمین کے ظلم و ستم کے دن کو نامرادی کی رات میں بدل دیتا ہے ۔ وہ عالمِ جسمانی میں بھی اور روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی مردوں کے اندر سے زندگی کا طوفان اٹھا دے تو ، اور ایسے ہی وہ زندوں کو مردوں میں بدل دے تو ، کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے ۔ اور پھر وہی ہے کہ کسی سے مادی و روحانی رزق سلب کر لے اور کسی پر اپنے رزق کے دروازے کھول دے تو آڑے آنے والا کوئی نہیں ۔

یہ آیت اپنے مفہوم کے لحاظ سے قطعی طور پر آیتِ انقلاب ہے ، یہ مشیت کے نظامِ تغیر کو واضح کرتی ہے اور وہی بات کہتی ہے جسے حضرت عیسیٰ نے کہا کہ کتنے ہی آگے ہیں کہ جو پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے ہی پیچھے ہیں کہ جو آگے آ جائیں گے ۔ مگر ساتھ کے ساتھ یہ آیت اس غلط فہمی کو بھی دور کرتی ہے کہ تغیرات کا تقدیری نظام کوئی غیر حکیمانہ نظام نہیں ہے کہ تقدیر اندھے کی لاٹھی کی طرح حرکت کرے ۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دستِ خیر کے ذریعے ہو رہا ہے اور ہر تغیر کے پیچھے حکمت و مصلحت موجود ہے اور ہر الٹ پھیر کے لیے قوانین ہیں ۔ اس آیت میں " بیدک الخیر " کے الفاظ ہی اصل سرچشمۂ تسلی ہیں کہ خدا تعالیٰ جب سارے تغیرات خیر کے لیے کر رہا ہے تو پھر وہ لوگ جو ایک نظامِ خیر و فلاح کے لیے معرضِ کشمکش میں ہوں ان کو مطمئن ہونا چاہیے کہ تبدیلی آئے گی تو ان کے ہی حق میں آئے گی ۔

اس آیتِ انقلاب کا اصل منشا کشمکش اور جہاد کے مراحل میں مومنین کو ثبات عطا کرنا تھا ، لیکن دنیا نے اسے بھی جبریت کے سرد خانے (Cold storage) میں رکھ کر ٹھنڈا کر دیا ہے ۔

اس آیت سے کچھ اوپر یہی حقیقت ایک اور انداز میں واضح کی گئی ہے۔ یہ نصیحت کرتے ہوئے کہ اگر تم پر ذرا کچھ آنچ آگئی ہے تو اس کی وجہ سے نہ تو ڈھیلے پڑو اور نہ ملول ہو کے پڑ رہو، جہاں تم کو گزند پہنچا ہے وہاں دوسروں کو بھی پہلے گزند پہنچ چکا ہے، خود نظام تقدیر کا ایک گوشہ بے نقاب کر دیا کہ:-

وتلک الایام نداولھا بین الناس۔ — اور ان دنوں کو ہم باری باری پھیرتے رہتے ہیں، ایام کو ہم اسی طرح لوگوں کے درمیان گردش دیتے ہیں۔

مطلب یہ کہ نفع و نقصان، کامیابی و ناکامی، مایوسی و امید، فتح و شکست کے حوادث کا تو ایک چکر ہے جسے قدرت الٰہی برابر گھما رہی ہے کہ کبھی تاریک رُخ سامنے آجاتا ہے اور کبھی روشن رُخ، کبھی دن ہے کبھی رات، کبھی اپنی بن آتی ہے کبھی مخالف کی، اور جن کو اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے وہ حوادث کے اسی الٹ پھیر کے درمیان سے بنائے جاتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی یہ توضیح بھی کر دی گئی ہے کہ گردش تقدیر کا ایک اصول یہ ہے کہ کفار کے مقابلے میں غلبہ اہل ایمان ہی کو ملتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح معنوں میں اہل ایمان ہوں۔ مسلمانوں میں یقین و طمانیت پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ واضح اور کونسے الفاظ ہوں گے۔

پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اسی گردش ایام کی کٹھالی میں پڑ کر تو وہ ایمان والے نکھرتے ہیں کہ جن کو اللہ منصب شہادت کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ اس اشارے میں خود یہ دعوت شامل ہے کہ منصب شہادت کے قابل بنو اور آزمائش آئے تو کھرے بن کر نکلو۔

آیت عدد جہد میں زیادہ منضبطی کی دعوت دے رہی ہے، مگر یہی آیات ہیں کہ جن کا موقع و محل نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ ان کو جمود و ملال ہی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں قصۂ طالوت کے اندر ایک حقیقت تقدیر یہ بھی واضح کی گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نظام مشیت نہ بناتا جس میں بگڑ جانے والوں کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے دوسرے بہتر لوگ اٹھائے جاتے رہیں تو ساری زمین اخلاقی فساد سے بھر جاتی۔ یہاں پھر یہ اشارہ اخذ ہوتا ہے کہ دشمنان حق

کا جو فیصلہ آج تم دیکھتے ہو اسے تہ و بالا کر نے ہی کے لیے تو نظامِ تقدیر کے تحت تم میدان میں آئے ہو۔ پھر جھجک کیسی! ہمت سے کام لو اور ٹکرا جاؤ!

تحریبِ انفاق کے لیے بیانِ تقدیر انفاق بھی طاعتِ الٰہی کا ایک بڑا شعبہ ہے۔ چنانچہ رزق کا نظامِ تقدیر بالعموم ان مواقع پر واضح کیا گیا ہے جہاں انفاق کی ترغیب دلانا مطلوب تھا۔ مگر کتنی عجب بات ہے کہ رزق کے نظامِ تقدیر کو زرپرست بخیلوں نے انفاق سے گریز کے لیے دلیل بنایا ہے۔ سورۂ یٰسین میں دیکھیے:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔

اور جب ان (کفار) سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے انفاق کرو تو یہ کفر کرنے والے ایمان والوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ کیا ان لوگوں کو ہم کھلائیں جن کو اگر اللہ نے کھلانا چاہا ہوتا تو خود کھلاتا۔ تم لوگ تو نہایت واضح گمراہی میں مبتلا ہو!

دیکھیے طاعت سے بچنے کے لیے کس شاندار طریق سے مسئلہ تقدیر (جبریت) کو آڑ بنایا گیا تھا اپنی ذمہ داریاں اٹھا کے کفار نے خدا کے سر ڈال دیں۔ خدا کا تقدیر رزق کا نظام تو تفاوت کے ساتھ رزق دیتا ہے تاکہ آزمائش کا مقام پیدا ہو اور جہاں کچھ لوگوں کے لیے صبر و کسب لازم آئے وہاں دوسروں کے لیے شکر و انفاق واجب ٹھہرے۔ لیکن جب ان سے مطالبہ ہوا کہ انفاق کرو تو وہ فرماتے ہیں کہ خدا خود ہی غریبوں کی دست گیری، یتیموں کی کفالت اور مساکین کی چارہ گری کیوں نہیں کر دیتا؟ جب اس نے ان کو غریب و مجبور بنایا ہے تو ہم کیوں بیچ میں مداخلت کریں۔

بات یہیں تک نہ رہی، بلکہ جب اللہ کے نام پر انفاق کا مطالبہ ہوتا تو کفار طنزاً کہتے کہ لو بھائی دیکھنا خدا غریب ہو گیا ہے اور اب ہم ہی غنی رہ گئے ہیں کہ اس کی کچھ مالی مدد کریں۔

لیکن قرآن تقدیر رزق کو بیان کرتا ہی ترغیبِ انفاق کے لیے ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں جہاں

مطالبہ کیا کہ اللہ کو قرض حسنہ دو، یعنی اس کی راہ میں مال خرچ کرو تو ساتھ ہی یہ فرمایا کہ :-

وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ۔ اور اللہ ہی (روزی کو) تنگ اور فراخ کرنے والا ہے۔

یعنی انفاق میں اس اندیشے سے کوتاہی نہ کرو کہ تمہارے حصے کا رزق کم ہو جائے گا اور تم جو کوں مرو گے نہیں جو اللہ انفاق کا حکم دے رہا ہے، روزی کو تنگ اور فراخ کرنے کے اختیارات بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ پس بخیل نہ ہو!

یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں کہی جہاں یہ فرمایا کہ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ وہاں ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ :-

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۝ یقیناً تیرا آقا اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو وسیع یا محدود کرتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔

یہاں بھی رزق کے نظام تقدیری کو اسی لیے بیان کیا کہ نہ اپنے اخراجات میں مسرف ہو، نہ حق کی راہ میں صرف کرتے ہوئے بخیل ہو، بلکہ اعتدال سے چلو کہ اپنی ضرورتیں بھی پوری ہوں اور دین کی تحریک بھی چلے۔ اور انفاق کرتے ہوئے یہ یقین رکھو کہ رزق دینے والا مالک تمہاری ضروریات سے باخبر اور تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے اور رزق کی فراخی و تنگی کرنے کے سارے ذرائع اس کے ہاتھ میں ہیں۔ "إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا" میں بالکل نمایاں طور پر شفقت اور کارسازی اور کفالت کی یقین دہانی موجود ہے۔

قتل اولاد کی ممانعت اور تقدیر رزق سورۂ بنی اسرائیل میں اور دوسری جگہ بھی اہل عرب کو قتل اولاد سے روکا گیا ہے۔ عرب میں اولاد (خصوصاً بیٹیوں) کو جن وجوہ سے قتل کیا جاتا تھا ان میں سے ایک بڑی وجہ مفلسی کا ڈر بھی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ کنبے کے افراد اگر بڑھ گئے (اور لڑکیاں بچاری کماؤ تو ہوتی ہی نہیں) تو تنگ حالی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے بچوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ان سے

روکا اور اس کی اصل وجہ پر بھی گرفت کی :-

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ

اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم ان کو رزق دینے والے ہیں۔ اور خود تم کو بھی!

یہاں دیکھیے کہ ایک شدید گھناؤنی معصیت سے روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اطمینان دلایا ہے کہ رزق پہنچانا ہمارا کام ہے اور خوش حالی اور غریبی مقدر کرنے کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں ہیں کنبے کے افراد بڑھ جانے سے ضروری نہیں کہ خوش حالی کا خاتمہ ہو جائے اور ان کی افزائش کو روک دینے سے ضروری نہیں کہ افلاس سے بچا جا سکے۔ لہٰذا اس معصیت سے باز آجاؤ اور اپنی اُلٹی سیدھی تدبیروں سے اپنی تقدیر بنانے کی کوشش نہ کرو۔

اسی اصول پر لونڈیوں سے عزل کرنے کے بارے میں نبی صلعم نے ممانعت فرمائی اور وہاں بھی نظامِ تقدیر ہی کو طاعت پر آمادہ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ فرمایا کہ تم کچھ بھی کرو جس جان کا پیدا ہونا مقدر ہے اسے کوئی تدبیر پیدا ہونے سے روک نہیں سکتی!

ہدایت و ضلالت اور تقدیر ہدایت و ضلالت بھی تقدیر کی بحثوں کا ایک بڑا موضوع رہا ہے۔ اس موضوع کو سب سے پہلے شیطان نے چھیڑا تھا۔ وہ حکم سجدہ کی تعمیل سے دیدہ و دانستہ خود انکار کرتا ہے لیکن اپنی ذمہ داری کو سر سے اتارکر خدا تعالیٰ پر ڈالنے کے لیے کہتا ہے کہ "رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ" اس کا مدعا یہ تھا کہ میں تو طاعت ہی کرنا چاہتا تھا لیکن تیری مشیت نے ایسے حالات میرے لیے پیدا کر دیئے کہ میں بغاوت پر بالکل مجبور ہو گیا۔ سرکشی میں نے کی نہیں، مجھ سے کرائی گئی ہے۔ کفر مجھے پسند نہ تھا، مجھ پر ٹھونسا گیا ہے۔ اپنے ان الفاظ کی روشنی میں شیطان فلسفۂ جبریت محضہ کا سب سے پہلا بانی ہے۔ مجرمین اور ضالین کی یہ خوشنما پناہ گاہ اسی کی بنائی ہوئی ہے۔

اسی شیطان کے شاگرد وہ بھی تھے جنہوں نے نبی صلعم کی دعوتِ ایمان و طاعت کے جواب میں یہ کہا تھا کہ :-

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ

اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے سوا

مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا کسی کی عبادت نہ کرتے اور نہ اس کے (حکم کے) بغیر
مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ط کسی چیز کو اپنے لیے حرام ٹھیراتے!

یعنی ہمارا شرک اور خدا کے مقابلے میں ہماری شریعت سازیاں کچھ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ہم خود سوچ سمجھ کر اس چکر میں پڑے ہیں، بلکہ خدا نے خود ہم سے یہی چاہا ہے اور ہم کٹھ پتلیوں کی طرح یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر وہ چاہتا کہ ہم یہ کچھ نہ کریں تو وہ ہمیں باز رکھ سکتا تھا۔ ہم بتوں کے سامنے سر جھکانا چاہتے اور وہ ہماری گردنیں پکڑ لیتا، ہم کسی حلال شے کو حرام کہنے کا ارادہ کرتے اور وہ ہماری زبان کو باندھ دیتا، بھلا اس کی عظیم الشان طاقت کے مقابلے میں ہماری کیا بساط تھی کہ ہم اس کی مرضی کے خلاف کسی اور طرف قدم بڑھا سکتے۔

ان کلمات کے ذریعے ان لوگوں نے اپنے علم و اختیار کی، اپنے منصب خلافت کی، اپنی انسانیت کی، اپنے ارادہ و انتخاب کی، اپنی قوتِ تمیز کی کُلی نفی کر دی اور سرے سے ذمہ داریانہ پن کی کوئی بنیاد ہی گویا نہ چھوڑی کہ اس بنیاد پر ان کو دعوتِ دین دی جا سکے۔

بھلا ان سے کوئی پوچھتا کہ اگر تم کسی جنگل میں بھٹک جاؤ تو کیا وہاں بھی اسی پوزیشن کو اختیار کرو گے کہ نہ کسی سے راستہ پوچھو، نہ غلط راستے کو چھوڑ کر دوسری طرف مڑو، بلکہ اگر کوئی بطور احسان تم کو بتائے بھی کہ یہ راستہ تو چیتوں کے بھٹ کی طرف جاتا ہے، شہر کو جانے والا راستہ اُدھر سے ہو کے گیا ہے تو تم اسے یہ جواب دو کہ اگر اللہ چاہتا کہ ہم اُس راستے پر چلیں تو وہ ہمیں خود ہی چلا دیتا، اب تو اس نے اِدھر ہی چلا دیا ہے لہٰذا اِدھر ہی چلیں گے، چاہے آگے چیتوں کے بھٹ ہوں یا آگ کے گڑھے؟

مگر نہیں، تقدیر کا یہ جاہلانہ تصور روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے کے لیے تھوڑی ہے۔ یہ تو صرف ایمان و اخلاق اور قلب و روح کی دنیا میں کام دیتا ہے۔

ایک اور جگہ تقدیر کے اسی استعمال کا تذکرہ یوں ہوا ہے:-

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ اب یہ شرک کرنے والے (دعوت الی اللہ کے جواب میں)

مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝

یہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا نہ شرک کرتے اور نہ (مشرکانہ عقاید کے تحت) کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ان سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں انہوں نے بھی ایسی ہی باتوں سے دعوتِ حق کو جھٹلایا، یہاں تک کہ ہماری گرفت کا مزہ چکھ کے رہے۔ پوچھیے ان سے کہ کیا تمہارے پاس (اس معاملے میں) واقعی کوئی علم ہے، اگر ہے تو لاؤ ہمارے سامنے۔ تم جن خیالات کے پیچھے چل رہے ہو وہ محض گمان ہیں اور تم محض تیر تکے چلاتے ہو۔

تقدیر کا یہ تصور جو ضلالت پر جمے رہنے کی دلیل بن جائے اور جو ہدایت کی طرف مائل ہونے میں رکاوٹ ہے قرآن اسے ظن وگمان قرار دیتا ہے اور اس طرح کے خیالات کو کہ خدا لوگوں کو جبراً معصیت وضلالت پر چلاتا ہے اور جسے ہدایت پر لانا ہو اسے زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی کھینچ لاتا ہے، خدا کی کتاب میں "تیر تکے اڑانے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ سب فضول قیاسات اور لغو فلسفہ طرازیاں ہیں۔ تقدیر کا یہ تصور قرآن کا نہیں، مشرکین کا ہے؛ خدا کا دیا ہوا نہیں، شیطان کا ایجاد کردہ ہے۔

دراصل دشمنانِ حق جب یہ سنتے تھے کہ ہدایت دینے والا اللہ ہے تو وہ پوری بات نہ سمجھنے کی وجہ سے طنزاً اس طرح کے نکتے نکال کر دعوتِ حق کی مدافعت کرتے تھے۔ ان کا کہنا اصل میں یہ تھا کہ ایک طرف تو تم لوگ کہتے ہو کہ من یھد اللہ فلا مضل لہ ومن یضلل اللہ فلا ھادی لہ، تو پھر تم ہمیں کس بنیاد پر یہ الزام دیتے ہو کہ ہم ضلالت میں پڑے ہیں اور کس بنیاد پر ہمیں بلاتے ہو کہ ہدایت قبول کریں؟ ہدایت وضلالت جب خدا کے اختیار میں ہیں تو ہماری کیا ذمہ داری!

مگر مخالف کم بخت کی نگاہ ہمیشہ حقیقت کے پورے منظر کو دیکھنے سے کتراتی ہے اور ادھورے پر آتی ہے، پھر ساری بحثیں اور سارے نتیجے اسی ادھورے منظر پر کھڑے کئے جاتے ہیں۔

لوگوں نے یہ تو سُن لیا کہ خدا ہدایت وضلالت دیتا ہے۔ لیکن ان کے کان یہ نہ سن سکے کہ وہ کیا کرنے والوں کو ہدایت دیتا ہے اور کیا کرنے والوں کو ضلالت دیتا ہے۔ اُن تک یہ بات تو پہنچ گئی کہ اللہ کے کرنے کے کام کیا ہیں لیکن یہ نہ پہنچی کہ بندوں کی ذمہ داریاں کہاں تک ہیں۔

قرآن نے خدا کے ہادی ومضل ہونے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جابجا یہ بھی بتایا ہے کہ ہدایت وضلالت کے دروازے کن لوگوں پر کھلتے ہیں، کن کنجیوں سے کھلتے ہیں اور کونسے انکار واعمال کے ساتھ ان دروازوں میں کسی کا داخلہ ممکن ہوتا ہے، اور دونوں طرف کیا کیا قوانین کارفرما ہیں۔ ہدایت وضلالت کی تقدیر میں انسان کا اپنا جو کچھ حصہ ہو سکتا ہے وہ خوب اچھی طرح کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

ہدایت وضلالت کی تقدیر قرآن میں تمام تر اسی لیے بیان ہوئی ہے کہ لوگ ضلالت سے بچنے اور ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک طرف قرآن یہ بتاتا ہے کہ فلاں فلاں آلائشیں دل سے پاک کرو گے تو اس کے دریچوں سے اللہ کے نور کی شعاعیں داخل ہونگی اور فلاں فلاں حرکتیں کرو گے تو یہ دل کے دریچوں کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا موجب ہونگی۔ ہدایت کا ایک راز یہ ہے کہ مانگو گے تو ملے گا، کھٹکھٹاؤ گے تو دروازے کھلیں گے، اپنے حواس کی کھڑکیاں کھلی رکھو گے تو روشنی اور تازہ ہوا اندر آئے گی، تعصب کے پردے اٹھاؤ گے تو حقیقتیں تمہارے گھر میں داخل ہونگی، تم خود آگے بڑھو گے تو تمہارا استقبال کیا جائیگا۔ اپنی آنکھیں کھولو گے تو دیکھو گے اور اپنے کان لگاؤ گے تو سنو گے۔

قانونِ ہدایت یہ ہے کہ:-

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝	اللہ (اپنے نور اور کتاب) کے ذریعے ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی رضا کے پیرو کار ہوں اور سلامتی کے راستوں پر چلیں، اور پھر وہ ان کو اپنے قانون کے تحت مختلف تاریکیوں سے نکال کر روشنی

میں لاتا ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی
کرتا ہے۔

یعنی ہدایت اس کے لیے ہے جو خدا کی رضا کو پیشِ نظر رکھے اور زندگی کے تمام معاملات میں سلامتی کے راستوں کا جویا ہو۔ یہاں تقدیرِ ہدایت بیان کرنے کا اصل تصور یہی ہے کہ طالبینِ ہدایت کو رضاءِ الٰہی کے اتباع اور سُبُل السلام پر چلنے کا جذبہ نصیب ہو۔ نہ کہ وہ آنکھیں بند کر کے چل نکلیں کہ اللہ خود ہی جدھر چاہے گا لے جائے گا۔

پھر فرمایا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اور وہ لوگ کہ جنہوں نے ہمارے لیے جدوجہد کی انہیں ہم (زندگی کے ہر میدان میں) اپنے راستے بہرحال دکھائیں گے۔

یہ ہے اللہ کا قانون تقدیرِ ہدایت و ضلالت کے بارے میں۔ اس کے بیان کا مدعا یہی ہے کہ لوگ ہدایتِ الٰہی کی طلب میں اس کے راستے میں جدوجہد کرنے کی اسپرٹ سے کر اٹھ کھڑے ہوں اور پھر اللہ پر بھروسہ کریں کہ وہ ان کی رہنمائی کرے گا۔

فلسفۂ تقدیر کا الٹا استعمال اوپر کی چند مثالوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ سوچیں تو پھر یہ حقیقت بہت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ قرآن کا فلسفۂ تقدیر ایمان و عمل اور جدوجہد کا فلسفہ ہے۔ لیکن جو لوگ اسے جمود و معصیت، خواہش پرستی اور بے دینی کے جواز کی دلیل بناتے ہیں دراصل ان کا فلسفۂ تقدیر ہے ہی بالکل دوسرا۔ ان کا نظریۂ تقدیر قرآن کے بالکل برعکس ہے ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

رسائل و مسائل

مچھلی کے بلا ذبح حلال ہونے کی دلیل

سوال: میری نظر سے "ترجمان القرآن" کا ایک پرانا پرچہ گذرا تھا جس میں انگلستان کے ایک طالب علم نے گوشت وغیرہ کھانے کے متعلق اپنی مشکلات پیش کی تھیں۔ جس کے جواب میں آنجناب نے فرمایا تھا کہ وہ یہودیوں کا ذبیحہ یا مچھلی کا گوشت کھایا کرے۔ مجھے یہاں موخر الذکر ماہا یعنی مچھلی غیر ذبح شدہ پر آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ کیونکہ غالباً آپ بھی جمہور مسلمانان عالم کی طرح اس کا گوشت کھانا حلال خیال فرماتے ہیں۔

میرے خیال میں حلال و حرام کا فیصلہ بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی انسان کا حق نہیں ہے کیونکہ خدا کا حکم ہے کہ ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب۔ ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون ۔ $\frac{۱۶}{۱۴}$ ۱۱۵-۱۱۶ ۔۔۔ لیکن قرآن کی رو سے مچھلی غیر ذبح شدہ کی حرمت تو موجود ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک حیوان ہے۔ اور تمام حیوانات کو (بغیر سور، کتا، بلی وغیرہ مستثنیات) ذبح کرنے کا حکم صریحاً موجود ہے۔ مثلاً:۔

۱۔ حرمت علیکم المیتۃ ۔۔۔ الخ ذالکم فسق ہے (مچھلی بھی میتۃ میں شامل ہے۔)

۲۔ یسئلونك ماذا احل لھم قل احل لکم الطیبات ۔۔۔ فکلوا مما امسکن علیکم واذکروا اسم اللہ علیہ ۔۔۔ الخ ہے یہاں تمام طیبات کو

ذبح کرنے اور ان پر خدا کا نام لینے کی تصریح ہے۔ مچھلی کی استثنا نہیں ہے۔

۳۔ فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ان کنتم بآیاتہ مومنین ۶/۱۱۹ یہ اثباتی پہلو ہے اسی امر کا کہ صرف خدا کے نام کا ذبح شدہ جانور کھایا کرو۔ یہاں بھی مچھلی بغیر ذبح شدہ کی استثناء نہیں ہے۔ بلکہ اسے خدا کا نام لے کر باقی حیوانات کی طرح ذبح کرنا چاہیے۔

۴۔ ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق (۶/۱۲۱) یہ نہی کا پہلو ہے۔ یہاں تصریف آیات کے بہترین نمونے ہیں۔ تاکہ اگر ایک طرح سے کوئی سمجھ نہ سکے تو دوسری طرح سے سمجھ جائے۔ اثباتی اور نہی ہر دو پہلو قرآن کے عام اسلوب کے مطابق اس معاملہ میں بھی موجود ہیں۔ اور یہاں تو غیر ذبح شدہ حیوان کو کھانا فسق قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پر بھی "الا السمک والجراد" کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا غیر ذبح شدہ مچھلی کا گوشت کھانا قطعاً حرام ہے۔

اب عرض ہے کہ مچھلی غیر ذبح شدہ کی حلت اگر کہیں قرآن کریم میں ذکر کی گئی ہے تو مہربانی فرما کر مجھے بذریعہ "ترجمان القرآن" مطلع فرمائیں۔ عام علماء اسلام تو وجدنا علیہ آباءنا" کی دلیل پیش کر کے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرآن کے بین احکام کی موجودگی میں اس قسم کی دلیل ہرگز کام نہیں دے سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مچھلی غیر ذبح شدہ کو حلال قرار دیا گیا ہے، لیکن قرآن کے مقابلہ میں قرآن کی دلیل پیش ہونی چاہیے۔ ہم ان احادیث کو تو بسر و چشم مان لیتے ہیں جو قرآن کے موافق ہوں لیکن اگر کوئی حدیث قرآن کے صریح فرمان کے خلاف ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز نہیں فرمائی بلکہ موضوع ہے اور احادیث کو قرآن پر قاضی سمجھنا تو خارج از بحث ہے۔

لہٰذا چونکہ بندہ آنجناب کے سامنے قرآن کے دلائل پیش کرتا ہے اس لیے استدعا

ہے کہ آپ بھی قرآن ہی سے دلائل پیش کریں۔ چار دلائل کے مقابلہ میں ایک دلیل بھی کافی سمجھی جائے گی۔

جواب :- یہ تو خوشی کی بات ہے کہ آپ قرآن مجید میں تدبّر فرماتے ہیں، مگر آپ کے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تدبر کی غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ قرآن پر تدبر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تبیین اور آپ کے شاگرد صحابہ کی توضیحات اور ابتدا سے آج تک کے تمام علماء فقہاء محدثین اور مفسرین کی تحقیقات، اور امت کے متواتر تعامل، ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بس مصحف کے الفاظ میں تدبّر فرمائیں، اور جو کچھ اس سے آپ کی سمجھ میں آئے اس کے متعلق یہ سمجھ بیٹھیں کہ بس یہی حق ہے اور اس کے خلاف جو کچھ بھی کہیں پایا جاتا ہے وہ رد کر دینے کے لائق ہے خواہ وہ احادیث و آثار میں ہو یا فقہائے امت کی تحقیقات میں، یا اس پر امت کا متواتر عمل پایا جاتا ہو۔ معاف فرمائیے، یہ طریقہ اگر آپ اختیار فرمائیں گے تو قرآن سے ہدایت پانے کے بجائے گمراہی اخذ فرمائیں گے۔ یُضلّ بہ کثیراً ویھدی بہ کثیرا وما یُضل بہ الا الفٰسقین الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض۔ آپ بُرا نہ مانیں۔ آپ تدبّر کا یہ طریقہ اختیار کر کے اللہ کی کتاب کا تعلق اس کے نبی کی تبیین سے کاٹتے ہیں حالانکہ اللہ نے خود اس کو جوڑا ہے (وما انزلنا علیك الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ)- اس لیے آپ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال رہے ہیں کہ کتاب اللہ سے آپ کو ہدایت کے بجائے ضلالت ملے۔

کتاب اللہ کو سمجھنے کے لیے احادیث و آثار اور سلف کی تحقیقات کی طرف رجوع کرنا ہرگز وہ فعل نہیں ہے جس پر ما وجدنا علیہ آباءنا کی پھبتی کسی جا سکتی ہو۔ یہ قرآن کی آیات کو قرآن کے منشا کے خلاف استعمال کرنے کی ایک بدترین مثال ہے۔ قرآن نے یہ بات جہاں بھی فرمائی ہے اُن لوگوں کی مذمت میں فرمائی ہے جو اپنے غیر ہدایت یافتہ آباء و اجداد کے

طریقے کی اندھی پیروی کر رہے تھے۔ اس کو ان لوگوں پر چسپاں کرنا جو کتاب الٰہی کا علم رکھنے والے لوگوں کی طرف کتاب الٰہی کا منشا معلوم کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں، نہ صرف یہ کہ منطقی طور پر غلط ہے بلکہ خود قرآن کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ اگر اس فعل کو آپ "وجدنا علیہ آباءنا" کے تحت لا کر ناجائز ٹھیراتے ہیں تو پھر قرآن کے ان ارشادات کا آخر آپ کے نزدیک کیا منشا ہے کہ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون، اور اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ؟

آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جو قرآن سے زائد، یا اس کے کسی بیان سے مختلف حدیث میں نظر آئے، وہ لازماً قرآن کے خلاف ہے اس لیے اسے رد کر دینا چاہیے۔ قرآن میں اگر کوئی حکم عموم کے انداز میں بیان ہوا ہو، اور حدیث یہ بتائے کہ اس حکم عام کا اطلاق کن خاص صورتوں پر ہوتا ہے، تو یہ قرآن کے حکم کی نفی نہیں ہے بلکہ اس کی تشریح ہے۔ اس تشریح کو اگر آپ قرآن کے خلاف ٹھیرا کر رد کر دیں گے اور ہر حکم عام کو اس کے عموم ہی پر رکھنے کے لیے اصرار کریں گے تو اس سے بے شمار قباحتیں پیدا ہوں گی جن کی مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں تو آپ خود مان جائیں گے کہ فی الواقع یہ اصرار غلط ہے۔

آپ اصرار کے ساتھ مطالبہ فرماتے ہیں کہ ذبح کے بغیر مچھلی کے حلال ہونے کی کوئی دلیل قرآن سے پیش کرو۔ میں اس کا جواب عرض کرتا ہوں۔ مگر ابتدا ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ جواب آپ کے اس مطالبہ کو اصولاً صحیح مان کر عرض نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ آپ کو یہ بتانے کے لیے عرض کیا جا رہا ہے کہ آپ کا مطالعۂ قرآن کس قدر سطحی ہے اور اس سطحی مطالعہ پر اعتماد کر کے آپ کا حدیث، تفسیر، فقہ، اور امت کے متواتر عمل، ہر چیز کو رد کر دینے پر آمادہ ہو جانا کتنی بڑی جسارت ہے۔ خدا کرے کہ میری اس تنبیہ کے بعد ہی آپ منکرین حدیث کے اٹھائے ہوئے فتنہ سے بچ جائیں اور تدبر فی القرآن کی صحیح روش اختیار کریں۔

پہلی بات تو اصولِ تفسیر سے متعلق ہے جسے آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ

قرآن مجید قانون کی زبان میں کلام نہیں کرتا بلکہ اس کا اسلوب بیان خطیبانہ ہوتا ہے۔ اور خطیبانہ اسلوب بیان میں نہ اُن چیزوں کی تصریح کی جاتی ہے جن کو مخاطب لوگ موقع و محل سے خود سمجھ رہے ہوں، اور نہ ان رعایتوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے جو قانون کی دفعات مرتب کرتے وقت نظر میں رکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ عام سامعین سے اس طرز کلام میں خطاب کرتے وقت یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ الفاظ کو ان کے معروف حدود سے گھٹا یا بڑھا کر اُن کے قانونی حدود پر منطبق کر بیٹھیں گے۔

اس قاعدے کو سمجھنے کے بعد اگر آپ اُن آیات پر غور کریں گے جن سے آپ نے "ہر جانور کو ذبح کرنے اور بلا ذبح کسی جانور کے حلال نہ ہونے" کا قانونی کلیہ مستنبط کیا ہے تو آپ کو خود معلوم ہو جائیگا کہ وہاں موقع و محل اور سیاق و سباق اور عرف عام سے یہ بات آپ ہی واضح تھی کہ کلام دراصل انعام اور خشکی کے دوسرے جانوروں سے متعلق ہے نہ کہ پانی کے جانوروں سے متعلق۔ نیز یہ بات چونکہ عقل عام (Common Sense) سے تعلق رکھتی ہے کہ "ذبح کے بغیر کسی جانور کو نہ کھانے" کا حکم عام سُن کر کوئی معقول آدمی اسے مچھلیوں تک وسیع نہ سمجھے گا، اس لیے ایک غیر قانونی طرز کلام میں اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ مچھلی کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا

اس کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن میں خصوصیت کے ساتھ پانی کے جانوروں کے متعلق کیا حکم ملتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ "تمہارے لیے حلال کیا گیا سمندر کا شکار اور اس کا طعام"۔ یہاں دو چیزیں لائق غور ہیں:۔

اوّل یہ کہ سمندر کا شکار حلال کیا گیا۔ شکار سے مراد یہاں فعل شکار نہیں بلکہ شکار کیا ہوا جانور ہی ہو سکتا ہے کیونکہ محض فعل شکار کی تحلیل بے معنی ہے اگر اس کا کھانا حلال نہ ہو۔ اور جب اس شکار کے لیے کوئی خاص شرط تحلیل بیان نہیں کی گئی تو یہی بات سمجھی جائیگی کہ عام طور پر دنیا میں پانی کا شکار جس طرح استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح اس کے استعمال کو حلال کیا گیا ہے۔ اب آپ تلاش کر کے بتلائیے کہ دنیا میں کب، کہاں مچھلیاں ذبح کی جاتی رہی ہیں کہ آپ صید البحر کے مفہوم میں عرف عام کے لحاظ سے شکار کی ہوئی مچھلیوں کے ذبح کو بھی شامل قرار دے سکیں؟ یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کو ذبح کیے بغیر کھانا دنیا بھر میں معروف ہو اس کے معاملہ میں ذبح کے مشروط ہونے کی تو تصریح ضروری ہوگی مگر اس کے

مشروط نہ ہونے کی تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔

دوم یہ کہ یہاں صید کے ساتھ ایک اور چیز کی تحلیل کا بھی ذکر ہے اور وہ ہے طعام البحر۔ سوال یہ ہے کہ یہ طعام البحر کیا ہے؟ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ طعامہٗ کی ضمیر بحر کی طرف نہیں بلکہ صید کی طرف پھرتی ہے اور اس کا مطلب ہے سمندری شکار کو کھانا۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا تو طعامہٗ کے بجائے طَعْمُہٗ کہا جاتا۔ اس لیے لامحالہ یہ ضمیر سمندر ہی کی طرف پھرتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صید البحر کے علاوہ طعام البحر بھی حلال ہے۔ اس طعام البحر کی کوئی تفسیر آپ کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔ مگر میں آپ کو یہ بتائے دیتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ جیسے لوگوں نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جسے شکار نہ کیا گیا ہو بلکہ جس کو سمندر نے ساحل پر لا ڈالا ہو۔ اور یہی بات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی حضرت جابر بن عبداللہ نے نقل کی ہے کہ ما القاہ البحر او جزر عنہ فکلوہ (ابوداؤد) جسے سمندر نے پھینک دیا ہو یا جسے ساحل پر چھوڑ کر سمندر کا پانی ہٹ گیا ہو اسے کھا لو۔ نیز اسی کی تفسیر یہ حدیث بھی ہے کہ "سمندری جانوروں کو اللہ نے بنی آدم کے لیے ذبح کر رکھا ہے" (دارقطنی) اور یہ کہ "سمندر کا مرا ہوا حلال ہے" (موطا وغیرہ)۔ آپ چاہیں تو ان ساری تفسیروں کو رد فرما دیں، مگر براہ کرم یہ بھی ضرور بتائیں کہ آپ خود صید البحر کے ساتھ "وطعامہٗ" کے حلال کیے جانے کا مطلب کیا سمجھتے ہیں؟

مچھلی کے بارے میں ابن قیم نے زاد المعاد (جلد دوم۔ فصل فی سریۃ الخبط) میں ایک لطیف بحث کی ہے۔ براہ کرم اس کو بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ اس میں انہوں نے نقلی دلائل کے سوا عقلی دلائل سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ مچھلی کو ذبح کرنے کی درحقیقت کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ محض پانی سے نکل آنا ہی اس کے تذکیہ کے لیے کافی ہے۔

ترجمان القرآن کا آئندہ شمارہ

سالانہ اجتماع سے قبل ہی شائع ہو رہا ہے۔ اور اس میں مولانا امین احسن اصلاحی کے قلم سے ایک اہم مضمون درج ہوگا۔ انشاء اللہ!

—منیجر

مطبوعات

Note of Dissent مرتبہ: ایم مسعود، آئی سی ایس قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

شائع کردہ: انصاری پبلشنگ ہاؤس ۲۔ وکٹوریہ چیمبرز، وکٹوریہ روڈ۔ کراچی ۳

ایم مسعود ایک حرکت پسند نوجوان ہیں اور انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں تقسیم ہند سے پہلے بھی اور تقسیم ہند کے بعد بھی اپنے طبعی میلانات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے پسے ہوئے عوام کے مسائل سے دلچسپی لی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد ایم مسعود کو ضلع نواب شاہ (سندھ) میں ہاریوں کی مظلومی کا جائزہ لینے کا موقع ملا اور ایسے حالات پیدا ہوئے کہ پاکستان کے اس بدنصیب صوبے کے تاریک ترین گوشے موصوف کے قلم سے پبلک کے سامنے آ گئے۔

مسلم لیگ کے کارناموں میں اعجوبگی تو ہمیشہ ہوتی ہے۔ قائد اعظم مرحوم نے جب یہ محسوس کیا کہ کسانوں اور ہاریوں کے مسائل کا حل کرنا ان کی اور ان کی جماعت کی اہم ترین ذمہ داری ہے اور سندھ منسٹری کے لیے ہاریوں کی فلاح و بہبود کا ایک ہشت نکاتی پروگرام مرتب کیا تو اس پروگرام میں ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل بھی ضروری قرار دی گئی تھی جو ہاریوں کے مسائل کا جائزہ لے۔ سندھ اسمبلی نے اس کمیٹی کے لیے مارچ ۱۹۴۷ء میں سر راجر تھامس کو جو سندھ کے ایک نمایاں زمیندار اور حکومت کے آنریری زراعتی مشیر تھے، صدر نامزد کیا اور مسٹر صدیقی ممبر پبلک سروس کمیشن اور مسٹر مسعود، آئی سی ایس، عام ارکان کی حیثیت سے لیے گئے۔ اکتوبر میں ایک چوتھے ممبر مسٹر کبار کا اضافہ کر دیا گیا جو ضلع لاڑکانہ کے ایک بڑے زمیندار اور حکومت کے اونچے عہدہ دار تھے۔ غور فرمائیے کہ زمینداران کرام اور عہدہ داران عظام کو ان لوگوں کی مظلومیوں کا جائزہ لینے پر مامور کیا گیا جو ان پر ظلم کرنے والے طبقے کے اہم عناصر تھے۔ اس کمیٹی کی اکثریت نے جس سے تنہا مسعود باہر رہے، تحقیق و جائزہ کے بعد ایک مایوس کن رپورٹ شائع کی۔ اس رپورٹ کے خلاف مسٹر مسعود نے ایک اختلافی نوٹ انگریزی زبان میں مرتب کیا جو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد اب کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

یہ نوٹ بڑے گہرے جذبات کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ہاریوں کے متعلق بڑی کارآمد معلومات اور

اعداد و شمار فراہم کرتا ہے جن لوگوں کے دل میں انسانیت کی فلاح کے لیے کام کرنے کا کچھ بھی جذبہ موجود ہو ان کو اس نوٹ کا مطالعہ لازماً کرنا چاہیے تاکہ وہ یہ اندازہ کرسکیں کہ معاشیات کے دائرے میں "اجتماعی چنگیزیت" کے کارنامے کیا کچھ ہوسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان حالات کو بہت سے حساس لوگ جب دیکھتے یا پڑھتے ہیں تو ان کا توازنِ جذبات اتنا درہم برہم ہوجاتا ہے کہ وہ اسلام کے اصولی و اخلاقی طریقِ اصلاح کو اختیار کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے اور اپنا ہاتھ کمیونزم کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں!

نوٹ کے چوتھے حصے میں مسٹر مسعود نے اپنے استدلال کی بنیادیں قرآن پر رکھنے کی جو کوشش کی ہے ہم بڑے ادب سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انتہائی بھونڈی اور مضحکہ خیز کوشش ہے۔ اس میں آیات کو ان کے موضوع اور محل سے بالکل منقطع کرکے اپنے مدعا کے سانچوں پر زبردستی ڈھال لیا گیا ہے۔ ہم مسٹر مسعود کے اس رویئے پر حیران ہیں کہ انہوں نے ہاریوں کے بارے میں اپنے خیالات پیش کرنے سے قبل مشاہدہ و مطالعہ کو جتنی اہمیت دی ہے اس کا دسواں، بلکہ سواں حصہ بھی اسلام کی تفسیر کرنے میں علم و مطالعہ کو اہمیت نہیں دی! اُدھر تو بغیر علم کے بات کرنے میں ساکھ گرتی ہے لیکن ادھر اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں محسوس کیا جاتا۔ کاش کہ مسعود یہ محسوس کرتے کہ اسلام آج ہاریوں سے زیادہ مظلوم ہے اور ان کو کبھی اس پر بھی رحم فرمانا چاہیے! مسٹر مسعود نے بعض باتیں تو بالکل کمیونسٹوں کے سے جذباتی پن کے ساتھ کہی ہیں، مثلاً یہ کہ کوئی صاحبِ دولت کبھی نبی یا امام نہیں بنایا گیا! یہ دعویٰ کرنے کے بعد آپ داؤد علیہ السلام کے بارے میں کیا فرمائیں گے اور اس حقیقت کو کہاں مخفی کریں گے کہ اکثر انبیا کھاتے پیتے گھرانوں ہی میں سے اٹھے لیکن انہوں نے اپنی خوشحالیوں کو مقصد پر قربان کر دیا۔

صفحہ ۵ا پر مندرج یہ سطریں مسٹر مسعود کی انصاف پسندی کی گواہی دیتی ہیں کہ: "میں اچھے زمینداروں کی بعض بہت ہی اعلیٰ اقسام کا وجود تسلیم کرتا ہوں کہ انسانیت کے پاکیزہ نمونے ہیں — لیکن وہ محض گنتی کے ہیں"!

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ وہ اصل شئے کیا ہے جو انسان کو انسانیت کا ایک اچھا نمونہ بنا سکتی ہے، اور اس کی بجائے ہاں اتنی کمی ہے کہ لاکھوں میں محض گنتی کے "آدمی اچھے بن سکتے ہیں! دوسرا یہ سوال کہ وہ شئے پیدا کیسے کی جائے اور اس کے لیے کس نوعیت کی اصلاحی و انقلابی تحریک چلائی جائے۔ اس کا جواب مسٹر مسعود کے نوٹ میں نہ ملے گا، بلکہ اسلام کے ہاں ملیگا — اس حقیقی اسلام کے ہاں جو مولوی اور مسٹر دونوں کی سطحِ فکر سے بلند ہے۔

OUR ENGLISH LITERATURE:

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231—Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72—Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64—Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56—Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56—Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56—Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36—Price As. 8

8. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96—Price Re. 1/8

9. **After Secularism what?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56—Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE
(Pakistan)

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے' اور دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ' طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں۔

پاکستان ـــ جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلامی نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں، تاکہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مددگار ثابت ہو گی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانائے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

جلد شائع ہو رہی ہے

ملنے کا پتہ:

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور۔ پاکستان

سرورق دین پریس' لاہور میں چھپا